# اسمٰعیل شہید

عبداللہ بٹ

قومی کتب خانہ لاہور

# مقالات
## یومِ شاہ اسمٰعیل شہید

# شاہ اسمٰعیل شہید

مُرتّبہ

عبداللہ بٹ

سکرٹری

آل پنجاب مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور

---

ناشر

قومی کتب خانہ لاہور

اشاعتِ اوّل ۱۵۰۰

شیخ محمد نصیر ہمایوں نے اتحاد پریس ہل روڈ، لاہور
باہتمام شیخ امین الدین چھپوا کر
قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور
سے شائع کیا

تاریخِ اشاعت
یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء

قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے

# لکھنے والے

# انتساب

شہدائے بالاکوٹ کی رُوحوں کے نام

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ

أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ○

# پیش لفظ

غلامی بہت بڑی مصیبت ہے، لیکن اس پر قناعت عذاب عظیم سے کم نہیں ہندوستان کے مسلمانوں پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ تنہا جسم کی غلامی ہی نہیں بلکہ ذہنی مرعوبیت بھی ہے۔ ہم نے سات سو سال تک اس ملک پر حکومت کی لیکن انقلاباتِ زمانہ اور حوادثِ روزگار سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہوئے کہ ایک طرف تو ماضی کی تمام روایات کو طاقِ نسیاں بنا دیا۔ اور دوسری طرف جمود و بے حسی کا اتنا مظاہرہ کیا کہ جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ یکسر قاصر ہے۔ اس مرعوبیت کا اثر یہ ہے کہ ہمارے کان ان بزرگوں اور مشاہیر کے نام سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا۔ بلکہ خدا کی زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کر کے دُنیا کو ہمیشہ کے لئے امن وسلامتی بخشنا چاہی۔ ہم نے قومی ہیروؤں سے جو شرمناک سلوک روا رکھا اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ہماری گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال کی علمی زندگی میں قومی ہیروؤں کے جس قدر تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سیّد احمد بریلوی رحؒ ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کا نام تک نہیں آتا۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور اُن کی جماعت نے اسلام کی آزادی کی خاطر جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں ہم اُن کے تصور سے بھی کانپ اُٹھیں۔ ان کی قربانیوں کو پڑھنے کیلئے

ناہیں کے جگر کی ضرورت ہے۔ آج ہندوستان کی آزادی کے لئے مختلف سیاسی جماعتیں جدوجہد
ہی ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں نے اپنی معمولی معمولی قربانیوں کو نمایاں کرکے پیش کیا ہے۔ لیکن
ہدین کی اس مختصر سی جماعت نے جو عظیم الشان قربانیاں کیں اُس کی مثال قرونِ اولیٰ کے مسلمانو
ے علاوہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لیکن ہم اس قدر خوفزدہ اور مرعوب ہو چکے تھے کہ ان بزرگوں
نام تک زبان پر لانا گناہ سمجھتے تھے۔

غلامی کے ان اثرات کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں پر قومی خیانت اور غدّاری کی لعنت
ے مسلط ہوگئی۔ ہماری تمام تحریکوں کی ناکامی کا باعث یہی غدّاری ہے۔ اپنی گذشتہ دو سو سال
تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ ہماری معمولی سے معمولی غدّاری نے ہمیں کس قدر نقصان پہنچایا۔
سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی شہادت میں یہ غدّاری کس قدر نمایاں ہے اور خود شاہ اسمٰعیل
شہید اور حضرت سیّد احمد بریلوی کی شہادت ہماری غدّاری کی ایک المناک داستان ہے۔

اس ماحول میں جس کے پس منظر کا ایک دھندلا سا خاکہ میں پیش کر چکا ہوں شاہ اسمٰعیل
شہید کی یاد منانا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ پنجاب کے طلبا کی اس مختصر جماعت نے وہ کام انجام
جو بڑی بڑی مذہبی اور سیاسی جماعتیں اپنے بلند بانگ دعادی کے باوجود نہ کر سکیں۔
تی کہ وہ لوگ بھی شاہ شہید کی یاد منانے سے گریز کرتے رہے جو مجاہدین کے ساتھ ایک
خاص قسم کے ذہنی لگاؤ کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔

ہم نے محسوس کیا کہ شاہِ شہیدؒ کے پیغام سے ملّت کے تنِ مردہ میں زندگی کی حرارت پیدا
کرنے کی ضرورت ہے اور شاہِ شہید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرکے مرعوبیت اور

جمود کے طلسم کو توڑنا چاہئے تاکہ حال کی بے حسی کو دور کر کے ایک شاندار مستقبل کی طرح ڈالی جائے

"یوم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مجوزہ صدر ہز ہائنس نواب سر محمد ناصر الملک مہتر چترال مرحوم کی غیر حاضری میں دو اجلاس منعقد ہوئے جن کی صدارت علی الترتیب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمائی۔

آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہندوستان میں پہلی جماعت ہے جس نے ٹیپو شہید کی یاد منائی اور اس موقع پر پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ شائع کر کے آزادیٔ ہند کے سب سے پہلے علمبردار کا یہ پیغام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا:-

"آزادی کی زندگی کا ایک لمحہ غلامی کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔

یہ خدائے بزرگ و برتر کا خاص لطف ہے کہ شاہ شہید کی یاد منانے کی سعادت بھی ہمارے ہی حصہ میں آئی۔ شاہ شہید کی زندگی میں صرف ایک چیز دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ کہ شاہ شہید ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے اور جب کلمۃ الٰہی کو اس کی ضرورت ہوئی تو آپ نے اس کی پہلی صدائے دعوت پر اپنی تڑپتی ہوئی لاش کا اضطراب اور اپنی گردن کے خون کا فوارہ پیش کیا۔ شاہ شہید کی یاد منانے کا مقصد یہی ہے کہ ہم بھی اپنی زندگیاں قوم اور ملت کے لئے مفید بنائیں۔ پنجاب کے مسلم طلبا کی یہ جماعت شاہ شہید کے پیغام کو ہندوستان کے اطراف و اکناف میں پہنچانے کا تہیہ کر چکی ہے اور مقالات کا یہ مجموعہ اسی مقصد کے حصول کی طرف ایک قدم ہے۔

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

یہ مقالات اردو اور انگریزی میں شائع ہو رہے ہیں، انگریزی کے مقالات حصّہ اُردو سے مختلف ہیں۔ مَیں نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ مسودے دکھائے تھے اور اُن سے مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی، چنانچہ مولانا اِن مسودوں کو ساتھ لے گئے اور آپ نے ان مضامین کو پسند فرمایا، نیز آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو مبارکباد پیش کی، ایک خط کے دوران میں آپنے اپنے مضمون کا عنوان بھی تحریر فرمایا۔ "ان فکری عوامل کی مختصر تاریخ جس نے مولانا اسمٰعیل شہید کی اصلاحی اور عملی تحریک کو پیدا کیا تھا"، یہ مضمون ابھی تشنۂ تکمیل تھا کہ مولانا نظر بند کر لئے گئے، اور ہم ایک نایاب مضمون سے محروم رہ گئے +

مولانا غلام رسُول مہر کے پاس شاہ شہید سے متعلق مستند مواد موجود ہے۔ آپ شاہِ شہیدؒ پر ایک مبسُوط کتاب تحریر فرما رہے ہیں +

مَیں نے مولانا سیّد ابو الاعلیٰ صاحب مودودی سے درخواست کی کہ "یوم شاہ اسمٰعیل شہید" کی رسمِ افتتاح آپ نے ادا کی تھی اس لئے اس مجموعہ کی بسم اللہ بھی آپ ہی کیجئے۔ مولانا موصُوف کا مختصر سا دیباچہ اسی درخواست کا نتیجہ ہے۔ مَیں اس کے لئے مولانا کا شکر گذار ہُوں +

مَیں مقالہ نگار حضرات کا تہ دل سے شکر گذار ہُوں کہ انھوں نے اس اہم قومی خدمت میں فیڈریشن کے ساتھ تعاون فرمایا۔ مَیں اپنے ان تمام دوستوں اور رفقائے کار کا ممنون ہُوں جنھوں نے اس مجموعے کی ترتیب کا کام میرے سپرد کیا اور مجھے یہ عزّت بخشی +

۱۳ - برانڈرتھ روڈ
لاہور

عبداللہ بٹ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ترکتازیوں کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے آخر ہی سے شروع ہوگیا تھا اور تیرہویں صدی تک جاری رہا، لیکن چند غیر معروف مستثنیات کی گنجائش رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی جہاد اس سرزمین پر صرف ایک ہی مرتبہ ہؤا اور یہ وہی جہاد تھا جس کے امیر حضرت سیّد احمد رائے بریلوی اور سپہ سالار حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تھے۔ پہلے کی لڑائیاں نہ تو خالصۃً للہ تھیں، نہ ان کی نہ میں خالص اسلامی سیرت تھی، نہ ان میں اسلامی قوانینِ جنگ کی پوری پابندی کی گئی، اور نہ اُن کے نتیجہ میں خلافتِ الٰہیہ کبھی یہاں قائم ہوئی۔ اس لئے وہ بس لڑائیاں تھیں، جہاد فی سبیل اللہ نہ تھیں۔ لیکن پوری بارہ سو سال کی تاریخ میں یہ دو اللہ کے بندے ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے تمام نفسانی، قومی اور ملکی اغراض سے اور تمام جاہلی تعصبات و خواہشات سے پاک ہوکر صرف اس لئے جنگ کی کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری ہو۔ فاسقین و فجّار کی جگہ صرف صالحین کی فوج مرتّب کی، جنگ و صلح دونوں حالتوں میں شریعت کے قوانین سے ذرّہ برابر تجاوز نہ کیا، اور جہاں ان کو حکمرانی کا موقع ملا وہاں بالکل خلفائے راشدین کے طرز کی حکومت قائم کی۔ دنیوی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں

مسلمانوں کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا واقعہ پچھلی عظیم الشان فتوحات اور سلطنتوں کے مقابلہ میں اتنا حقیر نظر آتا ہے گویا پہاڑ کے سامنے ایک رائی کا دانہ ہے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس ملک میں اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ سب سے زیادہ درخشاں ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا کی میزان میں ہندی مسلم قوم کے دوازدہ صد سالہ کارنامے میں سے جتنا حصّہ خیر کے پلڑے میں رکھے جانے کے قابل ہوگا اُس کا سب سے زیادہ وزنی جزء یہی ہوگا۔

اس عظیم الشان واقعہ کا جو اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر ہونا چاہیئے تھا افسوس ہے کہ وہ نہیں ہو سکا۔ ایک حد تک اس بےحسی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اعدائے دین کے خوف نے انہیں اس کا چرچا کرنے سے باز رکھا۔ مگر اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا معیارِ قدر بدل چکا ہے۔ وہ دین اور صداقت اور سیرت کے لحاظ سے نہیں بلکہ فتوحات کی وسعت اور سلطنت کے رقبے اور حکمرانوں کی شان و شوکت کے لحاظ سے قیمتیں مشخص کرتے ہیں، اس لئے پچھلے سلاطین کی تاریخ تو ان کے لئے سرِاعتنا کی مستحق ہے۔ مگر دو "مولویوں" نے ہندوستان کے ایک گوشے میں خدا کے لئے لڑ کر جو سر کٹا دیا وہ اُن کے نزدیک اتنا حقیر کام ہے کہ اس کی طرف کسی توجہ کی ضرورت نہیں۔ نہ کوئی ریسرچ اسکالر اس کی چھان بین کرتا ہے، نہ اس کی تفصیلات کے ریکارڈ جمع کئے جاتے ہیں، نہ کوئی اس کے آثار کی تلاش میں نکلتا ہے، نہ ان بزرگوں کی تحریروں کو مرتب کرکے شائع کرنے کی کوئی سعی کی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ عام تاریخوں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔

تاہم غنیمت ہے کہ اب ذرا کچھ ہوش آیا ہے اور تھوڑا بہت بالاکوٹ کے شہیدوں
کا چرچا شروع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدا جریدۂ الفرقان بریلی نے شہید نمبر کی اشاعت
سے کی تھی، اور دوسری چیز یہ مجموعہ ہے جو اس وقت شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک کامیاب
کوشش ہونے کے علاوہ نہایت ہی مبارک اقدام ہے جس کے لئے جناب عبداللہ بٹ صاحب
اور آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے دیگر ارکان تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔ لیکن اِن
چیزوں کو صرف ابتدا ہونے کی حیثیت ہی سے غنیمت کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں تو حضرت
سیّد احمد صاحب اور شاہ شہید کی تحریک کا جو حق ہندی مسلمانوں پر ہے اُسے ابھی واجب
الادا ہی سمجھنا چاہئے۔

ابوالاعلیٰ

# تمہیں سے اے مُجاہدو! جہان کا ثبات ہے

مولانا عبدالمجید سالک

ایڈیٹر

روزنامہ "انقلاب" لاہور

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہیں سے اے مجاہدو! جہان کا ثبات ہے

تمہاری ضَو سے پُرضیا جبینِ کائنات ہے
تمہاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے

کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی ممات میں
یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں

جدا ہو کائنات سے تو محو اس کی ذات میں
تمہارا امتیاز ہے دوام میں ثبات میں

بقا ہے جس کی ذات کو وہ اِک خدا کی ذات ہے

بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
مجاہدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں

مجاہد و شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
یہ جسم ہائے خونچکان و بے کفن عجیب ہیں

حیات بھی حیات ہے، تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری

چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل تاک کی کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی

لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم لے تمہیں وہ شہسوار ہو تمہیں وہ سرفروش ہو تمہیں وہ جاں سپار ہو

تمہیں دفاع و احترامِ دیں کے ذمہ دار ہو جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو

تمہاری تیغ ضامنِ نظامِ کائنات ہے

# اسوۂ شہید اور مسلمانانِ ہند

مولانا نصراللہ خاں عزیز
مدیر "مسلمان" لاہور

مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہنگامہ خیز زندگی سے مسلمانانِ ہند کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ متعدد اسباب کی بنا پر بہت ہی پیچیدہ ہے۔ اس راہ کی سب سے اہم مشکل یہ ہے کہ اس کے قابلِ تقلید اسوہ حسنہ کے اعتبار سے مسلمانوں کی نگاہ کا منتہائے مقصود ابتدا سے ہادئ عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت رہی ہے۔ آنحضرت کی حیاتِ مبارکہ جامع کمالات اور مجموعۂ حسنات ہے اور اس میں انسانی زندگی کے لئے نہ صرف مکمل ترین نمونہ موجود ہے بلکہ بہترین اسوہ ہے۔ اس لئے جب مسلمانوں کے سامنے کسی انسانی زندگی سے سبق اندوز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو نگاہیں مثالِ جمالِ محمدی پر جم کر رہ جاتی ہیں اور دوسری ہر زندگی خواہ وہ کتنی بلند مرتبہ اور پاکیزہ نہاد ہو گردہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں "ہیرو ورشپ" کا جذبہ ترقی نہیں کر سکا۔ لیکن شاہ اسمٰعیل شہید کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر ہمیں اس سے سبق اندوز ہونا چاہئے یہ ہے کہ اس کے جملہ کمالات خود شمع نبوت سے مستنیر ہیں۔ اور جب ہم شاہ صاحب کے واقعاتِ حیات سے کوئی سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو بالواسطہ طور پر اسوۂ نبوی ہی کی تقلید کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاہ صاحب کا ہم میں سے اور ہمارے جیسا ہونا تقلید و اتباع کے لحاظ سے زیادہ سہل ہے۔

## شاہ صاحب کا عہد

شاہ صاحب کی زندگی اس اعتبار سے بھی ہمارے لئے زیادہ اہم ہے کہ اس کی عام حیثیت ہمارے موجودہ حالات سے زیادہ مماثل ہے۔ انہوں نے بھی جس وقت دہلی کی زبوں حال بستی میں اپنی عبرت اندوز آنکھ کھولی تو مغلیہ سلطنت پر زوال کی آخری حالت طاری ہو چکی تھی۔ نہ صرف اندرونی طور پر حکومت کی رداے اقتدار پارہ پارہ ہو چکی تھی، بلکہ غیر ملکی تسلط و استیلا بھی حدِ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ دہلی پر حکومت بلاشبہ شہنشاہِ مغلیہ "خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ" کی تھی، مگر حقیقت میں کمپنی بہادر حکمران تھی۔ عوام گمراہ، اسلامی تعلیمات سے دور اور اتباعِ اسلام سے نفور تھے۔ اوہام میں مبتلا، مکار صوفیوں اور بے عمل علماء کے معتقد تھے۔ عیش پروری اور نفاق عام تھا۔ اور زندگی کا تصور اتنا اور اسی نوع کا تھا جتنا اور جیسا آج کل ہے۔ یعنی راحت و آرام سے انفرادی زندگی کا بسر کرلینا۔ کوئی بلند نصب العین پیشِ نظر نہیں تھا۔

ایسی حالت میں حضرت شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ منصۂ عمل پر نمودار ہوئے اور اپنی پُرخروش زندگی سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور ملتِ خفتہ کو اس قوت کے ساتھ جھنجھوڑا کہ یا تو لوگ اٹھ کر اُن کے ساتھ ہو گئے یا خوابِ شیریں کے برہم ہونے پر خفا ہو کر ان کے خلاف صف آرا۔ لیکن شاہ صاحب نے نہ اپنوں کی عقیدتوں سے دماغی توازن کو درہم ہونے دیا اور نہ مخالفین کی عداوت و اختلاف سے وہ ہراساں ہوئے۔ انہوں نے اپنے لئے اسلام کی تعلیمات اور سنتِ نبوی کی روشنی میں جو راہِ عمل تجویز کی تھی اس پر استقلال کے ساتھ گامزن رہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اتنے گہرے نقوش چھوڑ گئے کہ ہر صاحب نظر بے اختیار اُن کو بوسہ دیتا

اور اُن کی پیروی کو باعثِ سعادت سمجھتا ہے ۔

## حیاتِ شہید کا سب سے بڑا سبق

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا سب سے بڑا سبق "عمل" ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدارِ نجات صرف ایمان اور عملِ صالح ہے، بے عمل ایمان اور بے ایمان عمل دونوں ناکارہ ہیں۔ بلکہ نفاق جو بے ایمان بے عملی کا دوسرا نام ہے بدترین سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ قولِ بے عمل کو اللہ تعالیٰ نے "کبر مقتاً" سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ تصریحاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ ایمان اور عملِ صالح کے مالک ہونگے اُن کو دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں کی حسنات حاصل ہونگی اور جو لوگ اسلام سے بے بہرہ ہونگے مگر باعمل ہونگے اور زندگی کی غلط سلط جدوجہد کے مالک اُن پر بھی دنیوی کامرانی کے دروازے اس دنیا میں کھول دیئے جائیں گے۔ مگر جو لوگ منافق ہونگے یا بے عمل تو ان کو "خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا" دنیوی زندگی کی ذلت اور آخرت میں "اَشَدُّ الْعَذَابِ" کا مزا چکھنا پڑے گا ۔

حضرت شاہ صاحب نے جس روز سے ہوش سنبھالا قول اور عمل کی یکسانی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا۔ اُن کا دل گردوپیش کے حالات سے واقف ہوتے ہی سب سے زیادہ دو مصیبتوں پر کُڑھا۔ اول مسلمانوں کی اعتقادی گمراہی اور دینی بے عملی اور دوسرے غلامی۔ اور انہوں نے دونوں مصیبتوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ کر لینے کے بعد انہوں نے جہاد کا ساز و سامان فراہم کرنا شروع کیا۔ اول الذکر مصیبت کے اٹھانے کے لئے انہوں نے علمِ دین حاصل کیا اور ساتھ ہی علمِ دنیا منطق، فلسفہ، ہیئت، زبان دانی، تقریر و فصاحت، مناظرہ، تفسیر، حدیث اور فقہ جغرافیہ

تاریخ اور ریاضی۔ یہاں تک کہ معقولات و منقولات میں ان کو ید طولیٰ حاصل ہو گیا۔ اور بڑے بڑے علما اور مناظران سے بحث کرتے ہوئے گھبرانے لگے +

## جہاد کی تیاری

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فنِ حرب، پیراکی کشتی سواری اور دوسرے فنونِ متداولہ کی تحصیل کی۔ اور ان میں اتنی مہارت اور مشق بہم پہنچائی کہ دہلی جیسے سر آمد روزگار شہر میں جو شہسواروں، پہلوانوں پیراکوں اور پھکیتوں کا مرکز تھا شاہ صاحب کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اور کسی کی ہمت نہ رہی کہ اس "مولوی زادے" سے جس کو شمس بازغہ اور کنز و قدوری سے فرصت نہ ہونی چاہئے تھی پنجہ لڑا سکے یا دعوت مبازرت دے سکے۔ پیراکی میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ جمنا کی موجوں میں کھیتے ہوئے آگرہ پہنچ جاتے۔ سواری میں اتنی مہارت پیدا کی کہ سینکڑوں میل بے تکان اڑے چلے جاتے۔ پھر بدن کے دوسرے قویٰ پر قابو پانے کی مہم شروع کی، اور اس میں اتنے کامیاب ہوئے کہ فتح پوری مسجد کے سنگین فرش پر عین دوپہر کے وقت جون اور جولائی کے گرم مہینوں میں گھنٹوں برہنہ پا چلتے اور مطلق تکلیف محسوس نکرتے۔ ہفتوں کھانا نہ کھاتے اور کمزوری محسوس نہ کرتے۔ کئی کئی روز پانی کے بغیر گذار دیتے مگر معمولاتِ حیات میں فرق نہ آتا۔ سونے اور جاگنے پر بھی قدرت حاصل کر لی۔ جب چاہتے سو جاتے جب چاہتے جاگ اٹھتے۔ گرمی اور سردی کے متعلق جسم بالکل بے نیاز احساس ہو گیا۔ زندگی کا یہ پروگرام اس جہاد کی تیاری کے لئے تھا جس کا مقصد غلامی کو دور کر کے ملک میں منہاجِ نبوت کے مطابق حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا +

زندگی کی اس باعملی ہی کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب کی دعوتِ اصلاح پر ملک نے بلاتکلّف

لبیک کہا۔ یہاں تک کہ آج اس ملک میں توحید اور اتباعِ سنت کا جو کچھ غلغلہ ہے وہ زیادہ تر شاہ صاحب ہی کی سعی و جہد کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

## دعوتِ اصلاح

شاہ صاحب کی زندگی صرف عمل کی زندگی تھی۔ وہ جس بات میں اعتقاد رکھتے تھے اور اعتقاد کے لئے صرف کتاب و سنّت کو کافی جانتے تھے۔ اس پر عمل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ طوائفوں کو بھی دعوتِ توبہ و اصلاح دینی چاہئے۔ یہ سوچتے ہی وہ دہلی کی سب سے زیادہ مشہور طوائف کے ہاں پہنچ گئے اور اس جوش اور تاثیر کے ساتھ وعظ کہا کہ اس گنہگار طبقے کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور کئی رنڈیوں نے زندگی کا فاسقانہ انداز بدل کر پاکبازی اختیار کر لی۔ دہلی کے سب سے بڑے خاندان علماء کے ایک ممتاز چشم و چراغ کا اربابِ نشاط کے گھروں میں جانا کس کے وہم میں آ سکتا ہے؟ مگر تبلیغِ حق کے جذبے کو کوئی حجاب، شرم اور احتیاط روک نہ سکی، یہ شخصی عزت و وقار۔ خاندانی غرور و احترام اور شہری شہرت و آبرو سے بے پروائی کی مثال تھی۔ شاہ صاحب جہاں عقیدتوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح سلاطین و امرا کی ہیبت سے بھی بے نیاز تھے۔ بی بی کی صحنک اور تبرکات کے احترام کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب دنیوی جاہ و جلال سے بھی اعلائے کلمۃ الحق کے معاملے میں بالکل بے پروا تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ نرے خشک ملا اور محض بے باک عالم تھے۔ شاہ صاحب حریف کی دلجوئی کا بھی پورا خیال رکھتے تھے اور بے ضرورت مباحث میں قطعاً نہیں پڑتے تھے۔ مثلاً جب بادشاہ کے دربار میں اُلّو کی حلّت و حرمت کے بارے میں ہنگامۂ بحث و جدال برپا تھا اور علماء سُوء نے شاہ صاحب کو بھی اس میں مبتلا کرنا چاہا تو شاہ صاحب یہ کہہ کر اس دام سے نکل گئے کہ

مَیں الوؤں کے مسائل میں نہیں پڑا کرتا *

## لکھنؤ کا ایک واقعہ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زبردست مناظر تھے۔ شیعوں اور بدعتیوں کے مقابلے میں اُن کی زبان خارا شگاف تلوار تھی۔ جس کی کاٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ مگر بسا اوقات ان کی زندگی کی باعملی اور بے باکی منطقی اور کلامی دلیلوں سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں اہلِ تشیع کا غلبہ تھا۔ اور شاہ صاحب تشیع کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے کئی مناظرے کئے۔ کئی تقریریں ارشاد کیں۔ اور بندگانِ خدا راہِ راست پر آئے۔ مگر ایک موقعہ پر تو صرف شاہ صاحب کی سیرت ہدایت و اصلاح کا باعث ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک مجمع میں جہاں شیعوں کا غلبہ تھا اہلِ سنت واعظ و مقرر جان پر کھیل کر ہی تقریر کر سکتے تھے۔ شاہ صاحب نے فضائلِ صحابہ اور تردیدِ شیعیت کے متعلق بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ تقریر کرنی شروع کی۔ موقعہ و محل ایسا تھا کہ شاہ صاحب کو جان تک کا خطرہ تھا۔ مگر تمام خطرات سے بے پروا ہو کر وعظ کہتے رہے۔ ان کی بہادری اور جرأتِ ایمانی کو دیکھ کر ایک نوجوان شیعہ رئیس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے بھائی سے کہا کہ اگر یہ سُنّی مولوی اعلانِ حق میں اتنا بے باک ہے تو ناممکن ہے کہ شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ تقیہ کریں۔ یہ عملی منطق کی دلیل اتنی قوی تھی کہ اس کا بھائی بھی لاجواب ہو گیا اور دونوں بھائیوں نے وہیں اعلانِ توبہ کر کے اپنے سابقہ عقائد سے علیحدگی اختیار کر لی۔

شاہ صاحب کی سیرت کا یہی نمایاں عنصر ہے جس نے اُن کے رفقا کو بھی جرأتِ حق عطا کی اور ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس میں سلف صالحین کے اخلاق کی پوری جھلک موجود

ہی۔ جب حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کی
تحریک جہاد و دعوتِ اصلاح کا بظاہر خاتمہ ہو گیا۔ ضلع ہزارہ کے مسلمان منافقوں اور پشاور
کے غداروں نے اپنے امیر سے بے وفائی کر کے سکھوں کی گل ہوتی ہوئی شمع سلطنت کو بچا
لیا۔ تو مجاہدین نے ایک خفیہ پر امن مگر مجاہدانہ تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کا مرکز پٹنہ میں
تھا۔ اور اس کی شاخیں بتدریج پھیلتی ہوئی ثمرقند تک چلی گئی تھیں۔ جو لوگ اس تحریک میں
شامل ہو جاتے تھے وہ عقیدہ و عمل کی یکسانی کے پیکر ہوتے تھے۔ احکام و عبادات اسلامی
کے پورے پابند، نہایت باخدا اور متوکل۔ جری اور بہادر، اور ذہین و مدبر۔ وقتِ ضرورت
ان کا دماغ اور دل ان کو جواب نہیں دیتا تھا اور وہ اپنی جان پر کھیل کر تحریک کے اسرار کو
محفوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مجاہد سفیر کے طور پر سرحد سے آ کر پٹنہ جا رہا تھا۔ جب انبالہ
کے قریب پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ پولیس اس کی جستجو میں ہے۔ لہٰذا اُس نے چاقو سے اپنی
ایک آنکھ نکال کر گاڑی سے باہر پھینک دی اور خون پونچھ کر بیٹھ گیا۔ انبالے پہنچ کر پولیس
ہدایات دہی کے مطابق گاڑی میں آئی مگر وہ شخص جس کی تلاش میں تھی اُس کا کہیں وجود نہ تھا۔
اس لئے کہ وہاں تو ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس کی ایک ہی آنکھ تھی۔ یہ ایک معمولی سی مثال
ہے۔ اُن لوگوں کے کارناموں کی جو تحریک حریت و اصلاح کے داعی اور مبلغ تھے۔

میں یہاں اسی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس داستان کی جتنی ورق گردانی کی جائے
اتنا ہی معلوم ہو گا کہ شاہ صاحب کی زندگی کا نمایاں ترین عنصر "باعملی" تھی۔ اور اسی نے ان
کے اندر وہ تمام جوہر پیدا کر دیئے تھے جو ایک عظیم الشان انسان کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی

مشہور و معلوم سچا ئیوں پر عمل کرنا۔ آج ہندوستان کے مسلمان شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے جو سبق حاصل کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو عملی بنائیں۔ نظریوں کی وہ ہنگامہ آرائی جو آج ملت کی ناکام زندگی کی سب سے بڑی مصروفیت ہے ہماری تباہی کا حقیقی موجب ہے۔ ایک ذہین و طباع مگر بے عمل قوم دنیا میں کبھی سربلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب کی حیاتِ مبارکہ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں کتاب و سنت کا متبع بن کر ایثار و قربانی اور بے خوفی و بے باکی کی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور نفع و نقصان کی تمام مصلحتوں کو خدا کے حوالے کر دینا چاہیئے۔

# بالاکوٹ کی شہادت گاہ


مولانا غلام رسول مہر

ایڈیٹر

روزنامہ "انقلاب" لاہور

## حبّذا خاکِ پاکِ بالاکوٹ
## شدہ بہرِ مجاہداں مدفن

سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے سیر و سوانح پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک کتاب حال ہی میں سیّد صاحب کے خاندان کے ایک فاضل رکن نے شائع کی ہے لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ ضروری تھا ابھی تشنۂ تکمیل ہے اور سید صاحب کی تحریکِ عظیمہ کے کئی ابواب یا تو ابھی تک بالکل منظرِ عام پر نہیں آسکے یا آئے تو سراسر غیر مکمل صورت میں۔ ایک افسوسناک امر یہ ہے کہ عام لوگ سیّد صاحب کی شہادت کو اس تحریک کا آخری واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ شہادت کے بعد بھی اصل تحریک بڑے زور سے جاری رہی اور اس کا مرکز اب تک موجود ہے۔ اس آگ کو روشن رکھنے کی غرض سے مجاہدوں نے ہندوستان کے اندر اور باہر ایسی تکلیفیں اُٹھائیں، ایسی مصیبتیں جھیلیں کہ ان کا تصوّر بھی دورِ حاضر کے دعویداران حریّت و آزادی پر لرزہ طاری کر دے گا۔ لیکن ان کے مجاہدات کی تفصیل تو رہی ایک طرف ان کے ناموں سے بھی آج اہلِ ہند یک قلم بیگانہ ہیں۔

## سیّد صاحب کی بلندئ منزلت

ضروری تھا کہ یہ پوری داستان مرتب ہوتی۔ بتایا جاتا کہ جب ہندوستان میں اسلام کی سیاسی اقبال مندی کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف یاس و نومیدی کی ظلمت مسلّط تھی تو رائے بریلی کے ایک مجاہد سیّد نے بے سروسامانی کے باوجود طاقت کے احیا کا کتنا عظیم الشان انتظام کر دیا تھا۔ اور ان کی برکت سے غیرت و حمیتِ دینی کی کیسی آگ روشن ہو گئی تھی جس نے ہندوستان کے اندر اور باہر جگہ جگہ حرارت کے وسیع ذخیرے مہیا کر دیئے۔ ان کے ارادتمندوں نے اس روشنی کو مستقل و پائدار بنانے کے لئے ایثار و قربانی کے کتنے حیرت انگیز نمونے پے در پے پیش کئے جو اسلام کے بالکل ابتدائی دور کا بہترین پرتو تھے۔ جس فرض کی بجا آوری سے وقت کے حکمران و تاجدار اور اصحابِ خزائن و عساکر محروم رہے اس کا عَلَم ایک ایسے شخص کے ہاتھوں بلند ہُوا جس کے پاس دنیاوی سازوسامان کی کوئی متاع موجود نہ تھی حتّٰی کہ وہ عام معیار کے مطابق عالم بھی نہ تھا۔

## کم توجہی کے اسباب

سیّد صاحب کی تحریک کے پُورے حالات ابھی تک کیوں تفصیلاً مرتب نہ ہُوئے اور کیوں انہیں صحیح رنگ میں پیش نہ کیا گیا؟ اس کے متعدد وجوہ ذہن میں آتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ تحریک کے ابتدائی شرکا کا بڑا حصہ یا تو شہید ہو گیا یا پیشِ نظر مقصد کی سعی میں ہندوستان سے باہر مصروفِ جہاد رہا۔ ان لوگوں کو اتنا آرام میسر نہ آسکا کہ پوری سرگزشت مرتّب کر دیتے۔

۲۔ انگریزی حکومت کے ساتھ اس تحریک کے تصادم کے بعد ہندوستان کی فضا پوری تفصیلات کی اشاعت کے لئے سازگار نہیں رہی تھی۔

۳ - مذہبی تنگ نظری نے بانیانِ تحریک کے گرد وپیش تعصب کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی تھیں کہ اکثر اہلِ علم ان کے متعلق کچھ لکھنے میں تکلف محسوس کرتے رہے۔

۴ - تحریک کے متعلق مختلف تحریرات بکھری رہیں اور اب تک بکھری ہوئی ہیں۔ ان سب کو اکٹھا نہ کیا جا سکا بلکہ اکثر تحریرات تک اکثر اصحاب کی رسائی نہ ہو سکی، لہٰذا موجودہ دور کے مذاقِ تدوین کے مطابق مفصّل داستان مرتّب نہ ہو سکی۔

۵ - جن لوگوں نے حالات لکھے ان کا ذریعۂ معلومات مختلف تحریرات تھیں۔ یہ تحریرات بھی بعض حالتوں میں غیر مکمل تھیں۔ نیز سوانح نگاروں نے چونکہ مقاماتِ جہاد نہیں دیکھے تھے اس لئے وہ تحریرات سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا لکھ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج تفصیلات کے متلاشی طلبگاروں کے لئے ان کتابوں میں تسکین کا پورا سامان نہیں مل سکتا۔

## بالاکوٹ کا علاقہ

آخری سبب کی ایک نہایت عمدہ مثال واقعہ بالاکوٹ ہے جو سید صاحب اور شاہ صاحب کی شہادت گاہ ہے۔ میں ذیل میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس معرکہ کے متعلق شائع شدہ معلومات کس درجہ غیر مکمل ہیں۔ حالانکہ سید صاحب کی تحریکِ جہاد کا یہ ایک اہم معرکہ تھا۔ اس سے آپ کو تحقیق و تجسس کی وسیع ضرورتوں کا ایک نقشہ ذہن نشین ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں بالاکوٹ کی سرسری کیفیت بیان کر دینا ضروری ہے اور سہولت کی غرض سے میں نے اس مقام کا ایک خاکہ بھی پیش کر دیا ہے۔

بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے میں وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔ مانسہرہ

درہ کاغان
کھیت
مسجد کلاں متصل
قبر شاہ اسماعیل
کھیت
قصبہ بالاکوٹ
مٹی کوٹ
مدفن حضرت سید احمد
تھانہ پولیس
شمال
جنوب
کھیت
پل نہر
شالہ نجف
کشمیر تا مانسہرہ روڈ
گڑھی حبیب اللہ
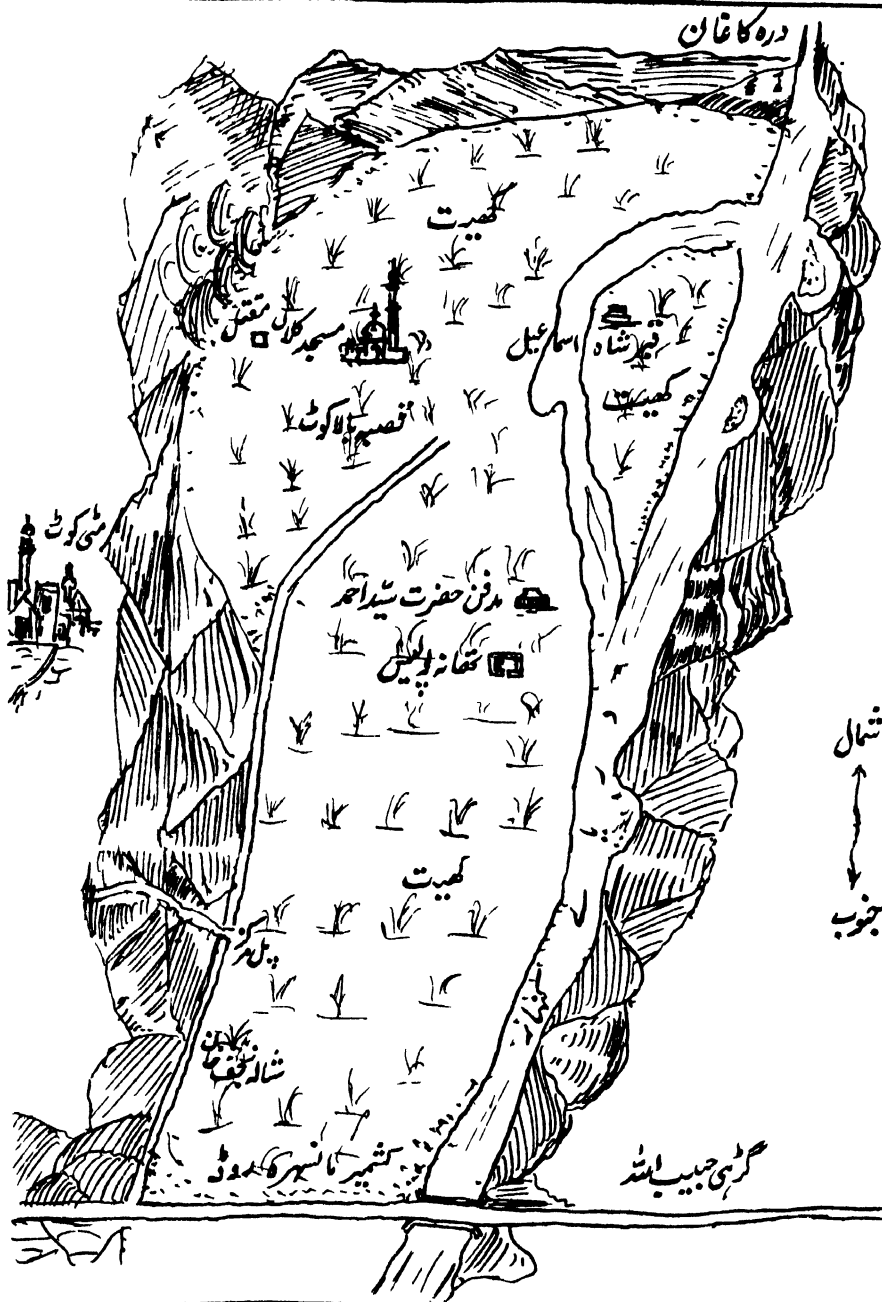
ہے کشمیر (نہ کہ) پاکستان میں ہے۔ شہر مظفرآباد سے آگے جا کر حبیب اللہ کے پاس کنہار نامی ایک دریا ملتا ہے
جو آگے بڑھ کر جہلم میں شامل ہو گیا ہے۔ اس کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ ایک سڑک شمال
نکلتی ہے جو وادی کاغان تک جاتی ہے۔ اس پر شہر کشمیر والی سڑک سے قریباً گیارہ میل کے
فاصلے پر بالاکوٹ واقع ہے۔ سڑک کے بعض حصے مسطح اور مستقیم ہیں بعض حصوں میں پہاڑی
سڑکوں جیسے نشیب و فراز اور پیچ و خم ہیں۔ موٹریں اور لاریاں آجا سکتی ہیں لیکن بعض مقامات
بڑے دشوار گزار اور خطرناک ہیں۔ یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ میری معلومات کے مطابق یہ سڑک
عہدِ انگلشیہ میں نکالی گئی ہے۔ سید صاحب کی شہادت کے وقت یہ موجود نہ تھی ممکن ہے یہاں
کوئی پگ ڈنڈی ہو۔

## مقام کی کیفیت

سارا علاقہ کوہستانی ہے۔ وادی کاغان کے جنوبی دہانے سے پہاڑوں کی دو بڑی فصیلوں
کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا طول بارہ چودہ میل سے کم نہ ہوگا۔ عرض کہیں دو
اڑھائی میل کہیں اس سے کم یا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس فضا میں مشرقی فصیل کے ساتھ ساتھ دریائے
کنہار بہتا ہے۔ اس کے آس پاس کھیت ہیں جن میں چاول، گیہوں وغیرہ بوئے جاتے ہیں۔
زمین سیراب و زرخیز ہے۔ بالاکوٹ دریائے کنہار کے مغربی کنارے پر اس حصے میں واقع ہے
جہاں پہنچ کر دریا وادی کاغان سے باہر آتا ہے۔ یہاں دریا کافی نشیب میں بہتا ہے۔ اور اس کی دو
شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ سیدھی مشرقی فصیل کوہ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چلی آتی ہے
دوسری شاخ میدان کے وسط میں گھومتی ہوئی اور بالاکوٹ کی آبادی کے چھوٹے ٹیلے کا دامن چومتی

ہوئی آگے بڑھ کر بڑی شاخ میں مل گئی ہے۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان جو زرعی زمین ہے اس میں بھی خوب کھیتی باڑی ہوتی ہے اس حصّے میں ایک جگہ دو تین درختوں کے درمیان چند قبریں ہیں جن میں ایک قبر مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کی ہے۔

قصبہ

قصبہ بالاکوٹ ایک ٹیلے یا اونچے مقام پر واقع ہے جو دریائے کنہار کے پہاڑ سے تو کافی بلند ہے لیکن دونوں جانب کی پہاڑی فصیلوں کے مقابلے میں بہت نیچا ہے۔ اس آبادی کے مغربی یا کہنا چاہئے جنوبی و مغربی کنارے پر مسجد کلاں واقع ہے جس کا ذکر سید صاحب کے جہاد کے سلسلے میں بار بار آتا ہے۔ اس کے شمال میں مسجد زیریں ہے۔ ان دونوں کی ہیئت اب بالکل بدل گئی ہے۔ آبادی اور مغربی و شمالی جانب سلسلہ کوہ کے درمیان کھیت ہیں۔

قصبہ اور ملحقات کی آبادی تین ہزار سے کم ہوگی۔ یہاں ہندو اور سکھ بھی آباد ہیں۔ دکانداری زیادہ تر انہی کے ہاتھ میں ہے۔ کاغان کے ساتھ تجارت کا یہ بڑا مرکز ہے۔

مٹی کوٹ

مغربی ٹیلے یا سلسلہ کوہ کا نام مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے۔ اس لئے کہ اس کے مغربی دامن میں مٹی کوٹ واقع ہے جس کے متعلق کہاوت مشہور ہے "جس کا مٹی کوٹ" اسی کا بالاکوٹ۔ مٹی کوٹ سے آگے نکل کر وادئ کاغان سے ملی ہوئی راج دواری کی وادی ہے۔ جہاں اہلِ سمہ یعنی مردان و پشاور کے میدانی علاقے کے باشندوں کی غداری کے بعد سید صاحب چلے آئے تھے۔ اور یہیں چھوٹی بی بی کے بطن سے سید صاحب کی دختر سیدہ ہاجرہ پیدا ہوئیں۔ اس کے پاس ہی بھوگڑ منگ اور سچون ہیں

## سیّد صاحب کا مرقد

مٹی کوٹ والے ٹیلے کے دامن میں یعنی بالاکوٹ کی آبادی سے مغرب کی طرف قریبًا ایک میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر وہ مقام ہے جہاں سید صاحب عام روایات کے مطابق شہید ہوئے۔ آبادی کے جنوب مشرق میں کچھ فاصلے پر دریائے کنہار کے قریب اور کاغان جانے والی سڑک کے کنارے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں چند قبریں ہیں ان کے وسط میں سید صاحب کا مرقدِ منور ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور سیّد صاحب کی قبروں کے درمیان کم از کم ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہوگا۔ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر دامنِ کوہ میں چند قبریں ہیں۔ عام روایات کے مطابق یہ بھی شہدا کی قبریں ہیں۔

## راستے کا نقشہ

بالاکوٹ سے مانسہرہ کشمیر والی سڑک کی طرف آئیں تو قریبًا تین چار میل کے فاصلے پر راستے میں ایک چھوٹا سا پل ملتا ہے جسے پل نرنّہ (بر وزنِ کھنّہ) کہتے ہیں۔ نرنہ ایک نالے کا نام ہے جو مغربی پہاڑ سے آ کر کنہار میں مل جاتا ہے۔ پاس ہی اس نام کا ایک گاؤں ہے۔ مشہور ہے کہ سیّد صاحب کا کٹا ہوا سر دریا میں بہتا ہوا آ رہا تھا۔ گاؤں والوں نے اُسے پانی سے نکال کر یہاں دفن کر دیا۔ کھیتوں میں ایک درخت کے نیچے جو غالبًا توت کا ہے۔ یہ قبر اب تک موجود ہے۔ اور آگے آئیں تو شالہ نجف خاں کی آبادی ہے۔

## جنگ کی تمہید

اس تفصیل کے بعد اب اصل واقعہ سنئے۔

سیّد صاحب ۱۸ جنوری ۱۸۳۱ء (۴ شعبان ۱۲۴۶ھ) کو راج دواری پہنچے تھے۔ اس کے بعد

مجاہدین نے سچون اور بھوگڑمنگ پر متعدد حملے کئے پھر بالاکوٹ پر قبضہ جما لیا اور مزید آگے بڑھ کر مظفر آباد کو بھی سنبھال لیا۔ راجہ شیر سنگھ اس زمانے میں پشاور گیا ہوا تھا وہ واپس آیا تو مجاہدین کے حملوں کی خبر پا کر اس نے سچون اور بھوگڑمنگ پر حملے کی تیاریاں کیں۔ سید صاحب نے تمام مجاہدین کو مختلف مقامات سے واپس بلا لیا۔ اور بالاکوٹ کو راجہ حبیب اللہ خاں کے حوالے کر کے سچون اور بھوگڑمنگ کی حفاظت کے لئے تیار ہو گئے۔ راجہ شیر سنگھ نے جب دیکھا کہ مجاہدین دھمیر زیادہ تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اور بالاکوٹ کے انتظامات ذرا کمزور ہیں۔ تو اس نے بالاکوٹ پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا۔ سردار حبیب اللہ نے سراسیمہ ہو کر کمک کے لئے التجا کی تو سید صاحب مجاہدین کو لے کر بالاکوٹ آ گئے۔

## سوانح نگاروں کا بیان

اس کے بعد سوانح نگاروں نے جنگ کی جو کیفیت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ راجہ شیر سنگھ کی لشکرگاہ بالاکوٹ سے دو کوس پر تھی مگر بیچ میں دشوار گزار پہاڑ حائل تھا جس سے سکھ لشکر کا گزرنا نہیں ممکن تھا۔

۲۔ شاہانِ سابق کا بنایا ہوا ایک راستہ اس پہاڑ میں سے تھا۔ مگر اس پر بہت زیادہ درخت اگ آئے تھے اور بالاکوٹ کے خاص خاص آدمیوں کے سوا کسی کو اس کی خبر نہ تھی

۳۔ سید صاحب نے اس راستے کی نگرانی کے لئے ایک گارد مقرر کر دی جو ستی مجاہدوں پر مشتمل تھی

۴۔ ایک دوسرا راستہ لاہور کی طرف جانے کا ایک پل پر سے تھا اس پر بھی مجاہدین حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔

۵ - غلطی یہ ہوگئی کہ کوہی راستے پر تھوڑے اور غیر معتبر آدمی متعین کئے گئے۔ راجہ شیر سنگھ حملے کو غیر ممکن جان کر واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک شخص نے کوہی راستہ بتا دیا جس سے سکھ اچانک پہاڑ پر پہنچ گیا

۶ - سید صاحب نے مسجد کلاں میں تختوں سے مورچہ بندی کر لی۔ تدبیر یہ تھی کہ جب سکھ پہاڑ سے اتر کر آگے بڑھیں گے اور آبادی پر حملہ آور ہونگے تو ان سے دست بدست جنگ کی جائے گی۔

۷ - آبادی اور پہاڑ کے درمیان کھیتوں کا ایک حصہ پانی کی وجہ سے دلدل کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ سکھوں کا ہراول ابھی اس دلدل کو عبور نہیں کر سکا تھا کہ سید صاحب مسجد کلاں سے نکل کر مسجد زیرین میں چلے گئے۔

۸ - پھر سید صاحب مسجد سے نکل کر دلدل کے کنارے پر جا پہنچے اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سکھ کچھ تو پہاڑ سے اتر چکے تھے۔ ایک کثیر تعداد اتر رہی تھی۔

۹ - مجاہدین کی ایک جماعت کے علاوہ سید صاحب کے ارباب بہرام خاں بھی جو علاقہ پشاور کے ایک معزز رئیس اور سید صاحب کے جاں نثار تھے۔ اس وقت ایک مجاہد نے کہا دل چاہتا ہے کہ اس دلدل سے گزر کر حملہ آوروں سے دست بدست جنگ کی جائے۔ سید صاحب نے اسے منع کر دیا۔

۱۰ - پھر سید صاحب نے خود ارباب بہرام خاں کے روبرو اسی قسم کی خواہش کا اظہار کیا۔ جاں نثار رفیق نے کہا جو لوگ نیچے اتر آئے ہیں ان کو ختم کر دینا مشکل نہیں لیکن ہم خود

پہاڑ سے اترنے والوں کی گولیوں کا ہدف بن جائیں گے۔ سیّد صاحب اس پر چپ ہو گئے

## واقعۂ شہادت

۱۱۔ بعد ازاں کسی اور کو اطلاع دیئے بغیر سید صاحب دفعتہً بسم اللہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر دلدل میں کود پڑے اور انتہائی تیزی سے پار نکل گئے۔ مجاہدین بھی ساتھ ہی کود ے۔

۱۲۔ سیّد صاحب اور مجاہدین کچھ مدت بپھرے ہوتے شیر کی طرح لڑتے رہے۔ پھر اچانک نظروں سے غائب ہو گئے۔ مستند بیان یہ ہے کہ سیّد صاحب زخمی ہو گئے تھے اور ایک پتّھر پر بیٹھے قبلہ رُو ہو کر دعا مانگ رہے تھے۔ پتّھر کے ساتھ ہی ایک خندق تھی۔ دفعتہً گولیوں کی ایک باڑھ آئی۔ خدا جانے کتنی گولیاں بیک وقت لگیں اور وہ شہید ہو کر خندق میں گر گئے۔ افرا تفری میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ اس لئے کہ لڑائی جاری تھی۔ مجاہدین میں سے اکثر نے بالاکوٹ کی آبادی کے ارد گرد کے علاقے میں لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کیا۔

## غور طلب سوالات

یہ مختلف بیانات کا خلاصہ ہے۔ اب کئی سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب مروجہ کتب سوانح میں نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ وہ کوہی راستہ کون سا تھا جس کا سراغ مل جانے سے سکھوں کے لئے بالاکوٹ پر حملے میں آسانی پیدا ہوئی؟

۲۔ لاہور جانے والے راستہ کا پُل کون سا تھا؟

۳۔ سید صاحب جب بالاکوٹ کی آبادی سے تقریباً ڈیڑھ میل مغرب میں شہید ہوتے تو ان کی قبر

آبادی سے کافی دُور باہر جنوب مشرق ہیں یعنی مقتل سے قریبًا ڈھائی تین میل کے فاصلے پر کیوں بنی؟ معلوم ہے کہ جہاں سیّد صاحب کی قبر ہے وہ آبادی کا قبرستان نہیں بلکہ وہاں اب بھی صرف چند قبریں ہیں جو غالبًا سیّد صاحب کی قبر کے بعد بنیں۔

۴ - ایک روایت یہ ہے کہ شہادت کے بعد راجہ شیر سنگھ نے سیّد صاحب اور شاہ صاحب کی میتوں کو شناخت کرانے کے بعد با اعزاز دفن کرایا۔ اگر یہ روایت درست ہے تو دونوں قبروں میں ڈیڑھ میل کا فاصلہ کیوں ہے؟

۵ - بعض روایتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سیّد صاحب سے پہلے شہید ہوئے۔ اگر یہ روایتیں درست ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی قبر سید صاحب کے مقتل سے قریبًا دو ڈھائی میل مشرق کی طرف ہے اور حملہ آوروں کا حملہ مغرب کی طرف سے تھا۔

## حملہ کس طرف سے ہؤا

مختلف ذرائع سے میں جو کچھ تحقیق کر سکا ہوں اُس کی مختصر سی کیفیت یہ ہے:

۱ - راجہ شیر سنگھ نے بالاکوٹ کے موجودہ راستے سے نہیں بلکہ مٹی کوٹ کی طرف سے حملہ کیا تھا۔ اس لئے کہ اول تو موجودہ راستہ اس وقت تھا ہی نہیں۔ دوسرے وہ تیس ہزار کے لشکر کو جس کے ساتھ توپیں بھی کافی ہونگی اس طرف سے نہیں لا سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر قابل توجہ امر یہ ہے کہ ابتدا میں وہ سچون اور رجھو گر ننگ پر حملہ کرنا چاہتا تھا جو مٹی کوٹ کے مغرب میں واقع ہیں۔ لیکن ادھر مجاہدین کا زور دیکھ کر وہ بالاکوٹ کی طرف پلٹ آیا۔ لہٰذا یہ کوہی راستہ مٹی کوٹ کی جانب ہوگا جس کی صحیح کیفیت مجھے تا حال معلوم نہیں ہو سکی۔

۲- اس خیال کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ شیر سنگھ کا لشکر مٹی کوٹ کے ٹیلے پر سے بالاکوٹ کی طرف بڑھا اور چونکہ کثیر لشکر تھا۔ اس لئے سمجھ لینا چاہئے کہ پورے مغربی پہاڑ پر پھیلا ہوا ہوگا۔ اور اُس نے بالاکوٹ کو شمال، شمال مغرب اور مغرب کی طرف سے گھیرے میں لے لیا ہوگا۔

## قبرِ مقتل سے دُور کیوں بنی

۳- پُل سے مقصود یقیناً وہی مقام ہے جسے اب نرتّہ کا پُل کہتے ہیں۔ اغلب ہے کہ سکھ لشکر کا ایک حصّہ نرتّہ نالے کے ساتھ ساتھ پہاڑ سے اتر کر جنوبی سمت سے بالاکوٹ پر بڑھا ہو تاکہ مجاہدین کے لئے بچ کر نکل جانے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔

۴- سید صاحب یقیناً بالاکوٹ کی آبادی کے مغرب میں شہید ہوئے۔ فتح کے بعد شیر سنگھ چار روز بالاکوٹ میں مقیم بنا رہا اور اس کی خیمہ گاہ دریا کے کنارے وہ میدان تھا جہاں اب تھانہ اور بعض دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ سیّد صاحب کی شہادت کے ثبوت فراہم کرے۔ چنانچہ شہدا کی میتوں میں سے سیّد صاحب کی میّت تلاش کی گئی اور شیر سنگھ کے اطمینان کے لئے لوگ اس میّت کو اٹھا کر خیمہ گاہ میں لائے۔ جب زخمی مجاہدوں یا شیخ وزیر گولہ انداز کے ہشت سالہ بچّے کے بیان سے تصدیق ہو گئی کہ میّت سید صاحب ہی کی ہے تو اسے پاس ہی ایک مقام پر دفن کرا دیا گیا۔

## کیا میّت بے سر تھی؟

۵- بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میّت بے سر تھی اور شناخت کرنے والوں نے محض لباس

سے سیّد صاحب کو شناخت کیا تھا اس کی تصدیق میں نہیں کر سکا۔ اگر یہ بے سرنعش تو سر کہاں کٹا؟ شناخت کیلئے سر بھی میّت کو ساتھ لاتے تھے یا مقتل میں چھوڑ آئے تھے؟ اگر مقتل میں چھوڑ آئے تھے تو پھر ترنہ میں سر کا دفن ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ اگر کٹا ہوا سر آیا تھا تو میت کے ساتھ اُسے کیوں دفن نہ کیا گیا؟ دریا میں کس نے بہایا اور یہ ترنہ کیونکر پہنچا؟ ان سوالوں کا مجھے تا حال جواب نہیں ملا۔

## شاہ اسمٰعیل کی شہادت

۶۔ یہ مسلّم ہے کہ ملکی باشندے سکھوں کے حملے کے ساتھ ہی آبادی چھوڑ کر کھیتوں میں جا چھپے تھے یا آس پاس کے دیہات میں چلے گئے تھے۔ چار روز کے بعد سکھ لشکر بالاکوٹ سے روانہ ہوا تو ملکی لوگ آئے اور انہوں نے مجاہدین کی میتوں کو جو جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں دفن کیا۔ میرا خیال ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اپنے مشہد کی جگہ دفن ہیں اور وہ بہ ظاہر سیّد صاحب کے بعد شہید ہوئے۔ روایت ہے کہ گھوڑے پر آپ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ آپ کو ناس سونگھنے کی عادت تھی۔ شہادت سے تھوڑی دیر پہلے ناس سونگھ کر ڈبیا پھینک دی اور کہا کہ "بس یہ آخری سونگھنا ہے" اس کے بعد لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء (۲۴۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) تاریخ تھی جس روز یہ قیامت خیز حادثہ پیش آیا۔

## سیّد صاحب کی شخصیت

سیّد صاحب عام طور پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:-

اے آنکہ زنی دم از محبت  از ہستئ خویشتن بپرہیز

برخیزد و بہ تیغِ تیز بنشیں یا از سرِ راہِ دوست برخیز

انہوں نے اپنے عمل سے اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق کر دی۔ نواب وزیرالدولہ مرحوم نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ توپوں اور بندوقوں سے آتش باری کے طوفان میں بھی سید صاحب کے چہرے پر تبسم رقصاں رہتا تھا۔

"و در معارکِ سخت و پیکار ہائے درشت کہ زہرۂ شیراں آب شدے و دلِ با ثباتِ دلیراں بے تاب گردیدے بر جبینِ نور آگین (حضرت سید) تغیرے نیفتادے و بر چہرہ سر بسر مہر تحیرے رونہ دادے۔"

ان الفاظ کو سامنے رکھ کر اپنے دماغ میں نقشہ قائم کیجئے اور سوچئے وہ کیسے بزرگ تھے، کیسے قدسی نفوس تھے کہ ایک مقصد کے تعین کے بعد اس مستعار زندگی کے ہر احساسِ حب و الفت سے دل کو پاک کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے لئے زندگی اور موت کے درمیان اس سے زیادہ کوئی فرق نہ تھا جیسے آدمی ایک مکان کے ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا جاتے۔ مطالعہ گاہ سے خواب گاہ میں یا خواب گاہ سے ملاقات گاہ میں پہنچ جاتے۔

## مجاہدین کا نقشہ

ایک شاعر نے مجاہدین کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے:-

ہمہ کارداں، رہبر شناس چو ایمانِ خود جملہ محکم اساس

وضو کردہ ہر یک بہ خونابِ خویش بہ شوقِ سجودے سر افگندہ پیش

گہے در رکوع و گہے در سجود گہے در قیام و گہے در قعود

یکے گرم سعی و یکے در طواف    یکے فدیہ گردید خود در مصاف

شمردند محراب شمشیر را
رسانند بر عرش تکبیر را

صولتِ فاروقی کے مصنف نے حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو
ں دُنیا کی دو چیزیں پسند ہیں۔

یکے قطرۂ خونِ مردِ شہید    کہ از دستِ کافر بمیداں چکید
دگر آں سرشکے کہ خوفِ الہ    فرو آرد از دیدۂ پر گناہ

سید صاحب کی جماعت نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان دونوں محبوب سرمایوں سے
انتہا حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ راہِ خدا میں بہایا۔ رزمگاہ سے
ہران کی آنکھیں خوف و خشیت الٰہی سے ہمیشہ اشکبار رہتیں۔ بڑے پاک لوگ تھے۔ بڑی بلند
زلت ہستیاں تھیں۔ پھر اس وجودِ مسعود کی برکتوں اور مجاہدانہ ... کی خداداد صلاحیتوں کا کون
یحیح اندازہ کرسکتا ہے جس نے جماعتی و قومی زندگی کی . . . . . . . . ہر عزیز
ع لُٹ جانے کے بعد ہر حلقے سے بے یقین افراد کا موادِ خام لے کر چند سال میں ایک ایسی
عت کھڑی کردی اور کیسی جماعت؟ جس کی نظیریں قرونِ اولی کے بعد کسی تاریخ میں بہت
ں شاذ ملتی ہیں اور جس کا ذکر لاکھوں کروڑوں دلوں میں یقین کی بڑی سے بڑی محکمی پیدا کرسکتا ہے
ی اللہ تعالیٰ عنہ

نوا فزوں ست ز اندازہ بریشم عود    غزل بہ زمزمہ خوانم کہ پردہ ہا بستند

# شاہِ شہیدؒ

مولانا یوسف سلیم چشتی
پرنسپل
اشاعت اسلام کالج لاہور

حیاتِ انسانی کے محیرّ العقول مظاہر میں ایک یہ بھی ہے کہ دنیا میں جس قدر بڑے آدمی گذرے ہیں بنی نوعِ آدم کا معتد بہ حصہ اُن کے متعلق کسی نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ضرور ہوا ہے اور جن لوگوں نے قوم کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، قوم کے اکثر و بیشتر افراد نے انہیں بلا تامل ہدفِ ملامت بنایا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی جن کی حیات افروز زندگی کا ایک ورق اس مضمون میں ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے، بلا شبہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جن پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر ناز کر سکتی ہے، ان کی تمام زندگی اوّل سے آخر تک اسوۂ رسول اللہ صلعم کی آئینہ دار ہے، اور ان کی شہادت تعلیماتِ قرآنیہ کی علمبردار ہے۔ مسلمان کی شناخت قرآن مجید نے یہ بتائی ہے کہ وہ حق کی حمایت اور باطل کے مقابلہ میں جانِ عزیز کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور مولانا موصوف اس قرآنی معیار پر ہر طرح پورے اترتے ہیں، ذٰلک الفوز العظیم۔

مسلمان وہ ہے جس کی نماز، عبادات، ومراسمِ مذہبی، زندگی اور موت خدا ہی کے لئے ہو، وہ جیے تو اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اور مرے تو اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر، اور تاریخ گواہ ہے کہ مولانائے موصوف نے فی الحقیقت اس آیۂ کبریٰ پر عمل کر کے دکھا دیا۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای

وممانی للہ رب العلمین۔

تاہم مسلمانوں میں آج بھی ایک گروہ ایسا موجود ہے جو انہیں کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہی نہیں سمجھتا بلکہ اُن کے عقیدتمندوں کو بھی کشتنی اور گردن زدنی قرار دیتا ہے

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ممکن اس میں یہ راز مضمر ہو کہ شہادت کی جنس گراں مایہ ارزاں نہ ہو جائے۔

## ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی حالت

شہید موصوف کی شخصیت کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بارھویں صدی ہجری یا اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی و مذہبی حالت کا دھندلا سا خاکہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے

اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور ان کی وفات کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت انحطاط پذیر ہو گئی اس کی وجوہ اگر عالم مادی میں دریافت کرنے کا شوق ہو تو حسب ذیل ہیں

۱۔ اورنگ زیب کے جانشین فرزندِ نوح کے مصداق تھے، وہ تختِ دہلی پر بیٹھنے کے لائق نہ تھے حکومت کرنے کی صلاحیت مطلقاً ان میں موجود نہ تھی۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو بالکل نفسِ امارہ کے غلام تھے۔ جو بادشاہ قرآن مجید لکھ لکھ کر اپنی قوت لایموت حاصل کرتا تھا اُس کے پوتے جہاندار شاہ نے تختِ سلطنت پر متمکن ہو کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی منظورِ نظر طوائف کے بھائی کو دہلی کا کوتوال مقرر کر دیا۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ اسی دیندار بادشاہ کا پرپوتا "محمد شاہ رنگیلا" کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے جو ۱۷۴۸ء تک دل کھول کر دادِ عیش دیتا رہا

۲۔ چونکہ سلاطین نااہل، نالائق اور نابینا تھے اس لئے امرائے دولت قدرتی طور پر باہمی رقابت

اور آویزش کا شکار ہو گئے۔ اور پرائے شگون کی خاطر اپنی ناک کٹوانے لگے۔

۳- جب مرکزی قوت کمزور ہو گئی۔ بادشاہ غافل، امرا کاہل اور عمّال ظالم ہو گئے، تو مخالفین اور سرکشوں کو خواہ مخواہ سر اٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ راجپوت مرہٹے، جاٹ اور سکھ چاروں قومیں باغی ہو گئیں۔

۴- ایسے موقع پر صوبے دار کیوں فائدہ نہ اٹھاتے؟ دکن، گجرات، بنگال، ملتان، اودھ اور مالوہ سب خود مختار بن بیٹھے۔

۵- ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ایرانی، مسافتِ بعیدہ طے کر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ہندوستان میں آیا، اور حتی المقدور ان کی جانی اور مالی خدمات انجام دے کر واپس چلا گیا۔ لیکن مسلمانوں نے جاگنے کی قسم کھالی تھی۔ اس لئے دلّی کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہتی ہوئی دیکھ کر بھی ان کی آنکھ نہ کُھل سکی اور محمد شاہ تو پہلے سے بھی زیادہ کُھل کھیلا، اُدھر نادر شاہ نے پیٹھ موڑی اِدھر دوبارہ طبلے پر تھاپ پڑی اور چشم زدن میں راجہ اندر کی محفل کا سماں دوبارہ قائم ہو گیا۔

۶- اگرچہ پانی پت کی تیسری جنگ نے جو ۱۷۶۱ء میں واقع ہوئی، ہندوستان میں مرہٹی حکومت کے خواب کو ہمیشہ کے لئے پریشان کر دیا، کیونکہ ملاءِ اعلیٰ میں یہاں کی حکومت مرہٹوں کے نہیں بلکہ انگریزوں کے نام لکھی جا چکی تھی، تاہم مرکزی حکومت کو بہت نقصان پہنچا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کا دیوالہ نکل گیا۔

۷- جاٹ گردی نے رہی سہی آبرو کو خاک میں ملا دیا اور سورج مل جاٹ نے دن دہاڑے آگرہ میں اندھیر

مچا دیا "جب قسمت خراب ہوتی ہے تو سورج سے بھی روشنی نہیں ملتی"۔

۸۔ سب کچھ جا چکا تھا، مگر ہنوز بادشاہ کی ظاہری آنکھیں موجود تھیں، غلام قادر روہیلہ نے سوچا کہ جب ان سے کام نہیں لیا جاتا تو پھر کیوں نہ انہیں جسم سے جدا کر دیا جائے؟ آخر ایک بے کار شے بادشاہ کے جسم نازک پر بار کیوں بنی رہے۔ شاہ عالم کی آنکھیں نہیں نکالی گئیں سلطنت مغلیہ اندھی ہو گئی، مگر تھی بہت سخت جاں برسوں سسکتی رہی۔

۹۔ ۱۸۵۷ء میں شاطر قدرت نے ایسا پانسہ پھینکا کہ فرنگی تاجروں کے "پو بارے" ہو گئے۔ میر جعفر کی "وطن دوستی" اور "نمک حلالی" کی بدولت جو لوگ آگ لینے آئے تھے، انہیں "پیمبری" مل گئی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد شہنشاہِ ہند بھی دلی چھوڑ کر اُن کے سایۂ عاطفت میں رہنے کے لئے الہ آباد آ گیا۔ مکان بغیر مکین کے رہ گیا،

۱۰۔ ۱۷۹۹ء میں ایک مرد خود آگاہ نے مادرِ وطن کے استخلاص کے لئے آخری کوشش کی۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میر صادق نے جس کے قالب میں شاید میر جعفر کی روح داخل ہو گئی تھی حق وفاداری ادا کر دیا اور سرنگا پٹم پر انگریزی پرچم لہرانے لگا۔ علامہ اقبال نے جعفر اور صادق کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے نقل کئے بغیر آگے بڑھنا گناہ سمجھتا ہوں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

الغرض جب مادرِ ہند کا یہ مایۂ ناز فرزند جو بقول اقبال "مشرق اندر خواب و او بیدار بود" اپنا فرضِ منصبی ادا کر کے آغوشِ لحد میں سو گیا تو اسلامی سیاست پر نزع کا عالم طاری ہو گیا اور

۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دلّی فتح کی تو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن

ناظرین! اٹھارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی سیاسی حالت کا اجمالی نقشہ پیش کر چکا، اب مذہبی حالت کی داستان بیان کرتا ہوں۔

ہندوستان جنّت نشان میں مسلمانوں کا قدم پہلے پہل ۷۱۲ء میں آیا، لیکن ان کی مستقل حکومت تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اگر وقت اور صفحات اجازت دیتے تو اس بے اعتنائی کا حال بالتفصیل بیان کرتا جو غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، سیدوں، لودیوں اور ترکوں یا مغلوں نے مذہب اسلام کے ساتھ روا رکھی اور مسلسل پانچ صدیوں تک روا رکھی۔

بس مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ سلاطین اور امرائے ہند نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے کوئی منظم اور باقاعدہ کوشش نہیں کی۔ اس فرض کی بجا آوری کے لئے کوئی محکمہ قائم نہیں کیا گیا۔ اسلام جس قدر پھیلا

(ا)۔ یا اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے۔

(ب)۔ یا حضرات صوفیائے کرام اور خصوصًا خواجگانِ چشت کی توجہ اور اُن کے فیض روحانی سے۔

(ج)۔ یا بعض مسلمانوں کی انفرادی کوششوں سے (جن کا ذکر آگے آئیگا) نام نہاد اسلامی حکومت نے اسلام کی تبلیغ کے لئے کچھ نہیں کیا اگر مسلمان حکمران تبلیغ کا محکمہ باضابطہ قائم کر دیتے اور اسی جوش و خروش، ہمت، حوصلہ، تعلیم اور خلوص کے ساتھ تبلیغ اسلام کی جاتی جس طرح آج تبلیغِ مسیحیت ہو رہی ہے تو آج ہندوستان میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا اور ہماری

سرکار" دولت مدار" کو ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے جو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اس کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔

جن بادشاہوں نے تبلیغِ اسلام کے لئے ذاتی اور انفرادی طور پر کوشش کی اُن کا حال ذیل میں قلمبند کرتا ہوں۔

۱۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں مبلغین تیار کئے جاتے تھے۔

۲۔ اورنگ زیب نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے اگرچہ کوئی خاص مدرسہ یا نظام یا محکمہ قائم نہیں کیا۔ تاہم اس کی اسلامی زندگی کی بدولت اسلام کو فروغ حاصل ہؤا۔

۳۔ سلطان محمود بیگڑہ والئ گجرات نے بھی تبلیغِ اسلام میں سرگرمی دکھائی۔

۴۔ سلطان شہید ٹیپو رح کو بھی تبلیغِ اسلام کا خاص خیال تھا۔

مسلمانوں کے ہفت صد سالہ عہدِ حکومت میں صرف یہ چار بادشاہ ایسے گذرے ہیں جن کو مسلمان بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔

بہرکیف بعض سلاطین حضرات صوفیا و علما اور بعض دردمند مسلمانوں کی انفرادی کوششوں سے اسلام اس ملک میں پھیلا اور اٹھارھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی تعداد کئی کروڑ سے متجاوز ہو چکی تھی۔

لیکن باقاعدہ مذہبی نظام نہ ہونے کی وجہ سے، ان نومسلموں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ اور بعض حالات میں مطلق انتظام نہ ہو سکا۔

ہندو عورتیں جب دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو وہ ٹھیک اسی طرح ہندو مراسم، عقائد،

رسُوم، توہمات اور خیالات اپنے ساتھ لیتی آئیں جس طرح یہود اور نصاریٰ جب فوج فوج دینِ اسلام میں داخل ہوئے تو اسرائیلیات کا انبارِ عظیم اپنے ساتھ لیتے آئے تھے جن سے ہماری اکثر کتب تفاسیر آج بھی بھری پڑی ہیں اور مرورِ ایام سے وہ روایات ہماری مذہبی زندگی میں کچھ اس طرح پیوست ہو گئی ہیں کہ آج اگر ان کو جدا کیا جائے تو مادۂ فاسد کے ساتھ جسم کا صحیح حصّہ بھی کھنچا چلا آئے گا۔

ہندو عورتوں سے شادی کرنے کی بدعت سلطان علاؤ الدین خلجی نے قائم کی اور اگرچہ اس طرزِ عمل سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ضرور ہوا لیکن یہ "دیویاں" بہت سی مشرکانہ رسُوم بھی اپنے ساتھ لائیں اور رفتہ رفتہ وہ رسُوم اور خیالات مسلمانوں کی تمدّنی زندگی میں داخل ہو گئے اور یہ چیزیں آج بیسویں صدی میں بھی مسلمان عورتوں کی مذہبی زندگی کا جزو بنی ہوئی ہیں اور اُن کی نظر میں انہی عقائد و رسُوم کا نام اسلام ہے

بعض اوقات ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ہوگا، مسلمان علما نے انہیں کلمہ پڑھا دیا اور اُن کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برائے نام تو مسلمان ہو گئے لیکن شرک اور توہم پرستی کی گمراہی سے باہر نہ نکل سکے۔

جہانگیر نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جب میں کشمیر جا رہا تھا دریائے جہلم کے کنارے قیام پذیر ہوا۔ دورانِ قیام میں مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کے مسلمان اپنے مُردوں کو دفن نہیں کرتے بلکہ چتا پر جلاتے ہیں اور اپنی مسلمان لڑکیوں کی شادی ہندوؤں کے ساتھ بھی کر دیتے ہیں۔

یہ حالات میرے قیاس کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ جو ہندو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان کی

مذہبی تربیت مطلق نہیں ہوئی۔

آج بھی یہی کیفیت ہے۔ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں لکھا ہے "ملکانہ راجپوتوں میں جو بظاہر مسلمان ہیں، ابھی تک بہت سی رسوم ہنود و مذہب کی موجود ہیں۔ یہ لوگ ہنود کے سے نام رکھتے ہیں، مندروں میں جاتے ہیں، دیوتاؤں سے استمداد کرتے ہیں، سلام کی جگہ وہی رام رام کرتے ہیں۔ اور اُن کی عورتیں بہت سی مشرکانہ رسوم میں گرفتار ہیں، تاہم ختنہ کراتے ہیں اور مُردوں کو دفن کر دیتے ہیں"

پس کوئی تعجب نہیں اگر اٹھارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے اندر آثار پرستی، مقابر پرستی، اولیا پرستی، جھاڑ پھونک، جنتر منتر، گنڈا، ڈوری، ٹونہ، ٹوٹکہ، بھوت پریت، مشرکانہ رسُوم، اور عقائد پائے جاتے ہوں۔

مَیں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ مسلمانوں میں ہر مرض کا علاج گنڈے ڈوروں اور ٹونے ٹوٹکوں سے ہوتا ہے یہ کیا بات ہے؟

قرآن مجید میں ان چیزوں کا مطلق ذکر نہیں۔ لیکن یجروید کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں ہر بات کا منتر موجود ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ جملہ امراض جسمانی و دماغی کے دفعیہ کے منتر

۲۔ کھیت میں افزائشِ غلّہ کا منتر

۳۔ دو آدمیوں میں عداوت کا منتر

۴۔ کسی عورت کو قابو میں لانے کا منتر

۵- قوتِ مردمی میں اضافہ کا منتر۔

اِن منتروں کے علاوہ اور بھی بہت سی اقسام کے منتر موجود ہیں۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانو میں بھی بحرِ دید کے متوازی رنگ میں آپ کو ہر کام کے لئے گنڈا تعویذ مل سکتا ہے بلکہ مسلمان تو اس فنِ شریف میں ہنود سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

۱- جن اور بھوت کے اتارنے کے لئے، جو خصوصیت کے ساتھ مسلمان عورتوں کے سروں پر سوار ہوتا ہے، عمل پڑھا جاتا ہے، اور بقول مستورات "حاضرات" کی جاتی ہے۔

۲- غیر معروف مقامات پر ایک چراغ اور دو چار پھولوں کے ہار رکھ دیئے جاتے ہیں اور چند روز کے بعد وہاں ایک "شہید مرد" کا نزول یقین کر لیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد کوئی نہ کوئی مجاور بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے، اور باقاعدہ جمعراتیں منائی جانے لگتی ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے وطن مالوف "بریلی شریف" میں بچشم خود بعض غیر معروف مقامات کو زیارتگاہ خاص و عام میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ آج کی باتیں ہیں جب کہ مذہبی تعلیم بھی عام ہوگئی ہے۔ مسلمانوں میں بیداری کی لہر بھی پیدا ہوچکی ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر میں اسلامی مدارس موجود ہیں تو ناظرین خود اندازہ لگائیں کہ اٹھارہویں صدی میں جب کہ ہندوستان میں بدنظمی اور طوائف الملوکی کا دور تھا اور عامۃ المسلمین جہالت کے سمندر میں غرق تھے۔ اس زمانہ میں ان کی ذہنی پستی اور مذہبی انحطاط کا کیا عالم ہوگا۔

مسلمانوں میں اصلاح کا کام ۱۸۶۷ء سے جاری ہے۔ لیکن کم و بیش ستر سال گذر جانے کے بعد بھی مشرکانہ رسوم اور خیالات ان میں موجود ہیں تو ۱۸۶۷ء میں اس لحاظ سے جو ان کی حالت

ہو گی اس کا تصوّر چنداں دشوار نہیں ہے۔ پوری تفصیل تو نہیں چند باتیں عرض کئے دیتا ہوں۔

۱۔ مسلمانوں میں بیوہ عورت کا نکاح ایسا ہی معیوب تھا جیسا کسی مسلمان کا لحم خنزیر کھا لینا۔

۲۔ قرآن مجید کا مادری زبان میں بھی ترجمہ کرنا جائز نہ تھا۔

۳۔ بیوی کی صحنک عورتوں میں اور تصوّر شیخ مردوں میں ان دو باتوں کو اسلام کی روح قرار دیا جاتا تھا۔

۴۔ قبر پرستی، پیر پرستی، آثار پرستی، تعزیہ و علم پرستی، رسوم پرستی، آبا پرستی مسلمانوں کا شعار زندگی تھا۔

اب ان کی مجلسی اور تمدّنی حالت پر نظر ڈال لیجئے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ سلاطین اور امرا عیش و عشرت میں مشغول تھے تو پھر عامۃ المسلمین کیوں نہ اُن کے نقشِ قدم پر چلتے۔ یُوں بھی جب کوئی قوم کئی صدیوں تک حکمرانی کر چکتی ہے تو اس کے اندر تن آسانی کا رنگ ضرور پیدا ہو جاتا ہے بقول علامہ اقبال ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

فنونِ لطیفہ کے علاوہ، فنونِ کثیفہ میں بھی مسلمان کسی سے پیچھے نہ تھے۔ جو لوگ دولتمند تھے وہ شاعری اور موسیقی کے علاوہ اپنا روپیہ اور روقت مرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی، پتنگ بازی اور تاش، گنجفہ، چوسر اور شطرنج میں ضائع کرتے تھے۔ شراب خوری اور کمار بازی دونوں چیزیں عام تھیں۔ یہ لوگ انہیں مطلق عیوب نہیں سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع تک بعض مسلمان جہلا اور عوام بغیر نکاح کئے عورتوں سے باقاعدہ تعلقاتِ زناشوئی قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

جہالت عام تھی اور مردوں اور عورتوں دونوں کے دماغوں پر اس ملکۂ خون آشام کی دو سیہ فام بیٹیوں تعصب اور توہم کی حکومت تھی۔ دینی علوم تو بڑی چیز ہیں، عامۃ المسلمین لکھنے پڑھنے سے بھی عاری تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت آج ناگفتہ بہ ہے۔ دنیا کی جملہ اقوام میں کوئی قوم مسلمانوں سے زیادہ جاہل نہیں ہے۔ تو آج سے ۱۵۰ سال پہلے جو حالت ہوگی اس کا اندازہ کیا دشوار ہے؟

علماء کا حال یہ تھا کہ ساری عمر منطق، فلسفہ کی کتابیں چاٹتے رہتے تھے۔ اگر دینی علوم پڑھتے تھے تو صرف فقہ حنفی کی چند مخصوص کتابیں (اور وہ بھی متاخرین کی تصنیف کردہ) یا زیادہ سے زیادہ بطور تبرک صحاح ستہ کا کچھ حصہ۔ قرآن مجید ان کے نصاب تعلیم میں مطلق داخل نہ تھا۔ محض برائے نام اس کے ڈھائی پاروں کی تفسیر پڑھ لیا کرتے تھے۔

تصوف کی تعلیم سراپا مسخ ہو چکی تھی۔ اولاً اسلامی تصوف میں ویدانت اور اپنشد کے عناصر داخل ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے مسلمانوں میں غلط اور گمراہ کن خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ تقدیر اور توکل دونوں کے معنی بدل گئے تھے۔ عملی قوت مردہ ہو گئی تھی۔ ثانیاً صوفیا کے مزاروں پر اُن کے متوسلین بیٹھے ہوئے تھے۔ جو زائرین سے استحصال بالجبر کو عین عبادت تصور کرتے تھے۔ اور قبر پرستی کی خوبیاں بیان کر کر کے اپنی آمدنی کے وسایل کو تقویت پہنچاتے رہتے تھے

یہ حالات تھے جب شاہ ولی اللہ کے خاندان میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے۔

مجدد صدی دوازدہم حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا اور حجۃ البالغہ لکھ کر مسلمانوں پر خدا کی حجت پوری کردی۔ یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ اسلامی لٹریچر میں مشکل سے کوئی کتاب اس سے

بڑھ کر پیش کی جا سکتی ہے۔

آپ کے چار صاحبزادے تھے۔ شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالغنیؒ۔ یہ چاروں ایک لائق باپ کے لائق بیٹے تھے۔ اور آسمان علم وفضل پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ مسلمان بھی قرآن مجید سے مستفید ہو سکیں جو فارسی سے نابلد تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی قرآن اور سنّت کی ترویج کو شعارِ زندگی بنایا اور وہ ہندوستان کے آخری عالم تھے جن کی عزت انگریزی حکومت بھی کرتی تھی۔ دلّی کا کلکٹر ہر اتوار کی صبح کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ کیا انقلابِ زمانہ ہے آج علماء سلام کرنے جاتے ہیں!

شاہ صاحب نے شیعوں کے مقابلہ میں تحفہ اثنا عشری قابلِ دید کتاب لکھی ہے۔ آپ نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔

شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے وعظ و تذکیر کا مشغلہ اختیار فرمایا تھا اور دہلی کی جامع مسجد ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید انہی کے فرزند ارجمند تھے۔

## ابتدائی زندگی

مولانا ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو علم وفضل اور زہد و تقوٰی کے لحاظ سے ہندوستان میں آپ ہی اپنی نظیر تھا۔ وہ عارف باللہ حضرت شاہ عبدالرحیم کے پرپوتے مجددِ وقت حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے، حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے بھتیجے اور حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے بیٹے تھے، آنکھ کھولی تو گھر میں خدا اور رسول کا ذکر سنا۔ بڑے ہوئے تو حضرت محدّث

دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علومِ ظاہری کے علاوہ علومِ باطنی سے بھی بہرہ وافر پایا تھا۔ قانونِ مشیّتِ ایزدی، قانونِ توارث، افتادِ طبع، تربیت اور ماحول یہ جملہ عناصر ایسے تھے جنہوں نے ان کو اپنے زمانہ کا عدیم المثال انسان بنا دیا۔

تحصیلِ علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چل کر، وعظ و نصیحت کا بازار گرم کر دیا اور ۱۸۱۷ء میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے انتقال کے بعد مسندِ درس و افتا کو زینت بخشی۔

مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لئے تقویۃ الایمان لکھی اور دہلی کی جامع مسجد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، ان کے مواعظ نہایت دلپذیر اور مفید و خلائق تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں کے محبوب رہنما بن گئے۔

اس زمانہ میں جامع مسجد کے اندر حوض کے اردگرد بازار لگا کرتا تھا۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار تھی۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی سے اجازت لے کر اس رسمِ قبیح کو بند کرا دیا۔ کیونکہ مسجد ذکرِ خدا کے لئے ہے نہ کہ خرید و فروخت کے لئے۔

تقویۃ الایمان میں انہوں نے عام مسلمانوں کے خیالات اور معتقدات کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا، اس لئے بہت سے عوام ان سے برگشتہ ہو گئے۔ دلّی میں اس وقت مولوی فضل حق خیرآبادی منطقی بھی جو حاکم وقت کے دفتر میں سر رشتہ دار تھے، مولانا کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے مسئلہ امتناعِ نظیر پر مولانا سے بحث شروع کر دی۔

پنجاب اس زمانہ میں سکھوں کے زیرِ حکومت تھا اور پشاور سے لے کر رہتک تک ان

کی مسلم آزار روش کی وجہ سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، مساجد میں بھی اذان دینی ممنوع تھی اور لاہور کی تمام بڑی بڑی مساجد میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور سامانِ حرب رکھا ہوا تھا چنانچہ لاہور میں آج بھی ایک مسجد بارود خانہ والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن مجید کی علانیہ بے حرمتی کی جاتی تھی۔ شعائرِ مذہبی کی روزمرہ توہین ہوتی تھی۔ اور مذہبی فرائض کی بجا آوری بعض صورتوں میں بالکل ناممکن ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال نے ایک شعر میں یہاں کی حالت کا عبرت انگیز نقشہ کھینچا ہے۔ غالباً وہ صورتِ حالات سے آگاہ کرنے کے لئے کافی ہوگا:۔

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

مولانا کا دل یہاں کے حالات و واقعات سن سن کر بہت کڑھتا تھا اور آخر کار انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ سکھوں کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کرنا چاہیئے۔ اس معاملہ میں حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی رح جو تیرھویں صدی کے مجدّد تھے، ان کے ہمنوا اور ہم خیال بن گئے، اِن دونوں صاحبوں نے اللہ کا نام لے کر دہلی کی جامع مسجد میں جہاد کا وعظ کہنا شروع کر دیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد مجاہدین کی ایک جماعت تیار کر کے ۱۲۴۱ھ میں بارادۂ جہاد دہلی سے روانہ ہو گئے۔

جنوبی پنجاب میں مجاہدین کو بہت کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کے بعد ان حضرات نے یہ خیال کیا کہ سرحد کے افغانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لینا چاہیئے۔ اس لئے مجاہدین کی یہ جماعت

یاغستان کی طرف روانہ ہوئی اور وہاں کے باشندوں میں جہاد کی تبلیغ کرنے کے بعد از سرنو معرکۂ کارزار گرم کر دیا۔

چونکہ مشیّتِ ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا اس لیے ۱۲۴۶ھ میں سید صاحب اور مولانا دونوں نے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش فرمایا اور مجاہدین کی جماعت ناکام واپس آ گئی۔

اگرچہ مولانا کو اس معرکے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تاہم انہوں نے دنیا کو سبق دے دیا کہ مسلمان باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتا، جہاد فی سبیل اللہ کا یہ آخری نظارہ تھا جو ہندوستان کی آنکھوں نے دیکھا، اس کے بعد ایسا انقلابِ عظیم رونما ہوا کہ مسلمان جہاد تو درکنار تلوار سے بھی محروم ہو گئے۔

مولانا اسمٰعیل شہید کی زندگی اول سے آخر تک بیسویں صدی کے مسلمانوں کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔ ان کی زندگی کے فلسفہ کو علامہ اقبال نے اس طرح زیبِ قرطاس کیا ہے۔

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد | زانکہ این مرگ است مرگِ دام و دد
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک | آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ، انتہائے راہِ شوق | آخرین تکبیر در جنگاہِ شوق

خدا کرے مسلمانوں کو اس موت کی آرزو پیدا ہو جائے تاکہ ملّت کی زندگی کا سامان از سرنو مہیّا ہو سکے۔ آمین

# اسلامی حُرّیت کا علمبردار

مولانا محمد میاں دیوبندی

مصنّف

عُلمائے ہند کا شاندار ماضی

صداقت مشک ہے۔ مہکنا اُس کی فطری خاصیت ہے۔ گیا اوقات باطل کا نافہ اس کو چھپا لیتا ہے؛ مگر یہ پوشیدگی عارضی ہوتی ہے۔ صداقت کی مہک باطل کے نافہ میں اور تیز ہوتی رہتی ہے حتّٰی کہ خود نافۂ باطل مشکِ صداقت کا پتہ دینے لگتا ہے۔ پاکیزہ طبیعتیں جو مشک کی طالب ہوتی ہیں۔ وہ نافہ کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتی ہیں۔ اور مشکِ صداقت اپنی پوری پاکیزگی سے دل و دماغ کو معطّر کرنے لگتا ہے۔ رُوح کو تازگی بخشتا ہے۔ انسانیت کے لطیف عنصر کو قوت پہنچاتا ہے۔ اور دنیا اس منظر کو برای العین دیکھ لیتی ہے۔ کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط — حق آیا، باطل مٹ گیا باطل اسی لئے

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — ہے کہ مٹے۔

حضرت اسمٰعیل شہید کی پاکیزہ سیرت اسی فطری رفتار کا ایک نقشہ ہے۔ باطل پرستوں کی بطلان پرستی نے ایک عرصہ تک حقیقت کو چھپائے رکھا۔ حضرت شہید کے متعلق یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ آپ مخصوص اصطلاح کے لحاظ سے وہابی تھے۔ معاذ اللہ آپ کے دل میں نہ اولیاء صادقین کی عظمت تھی نہ انبیاء علیہم السلام کی۔ معاذ اللہ اسی ملاگردی کی کوتاہ اندیشیوں میں آپ جان دے بیٹھے اور لُطف یہ کہ خود شہیدِ اقدس کے ہمنوا حضرات بھی باطل کی تاریک چادر سے کچھ مرعوب ہو گئے۔

یعنی حضرت شہید کی شہادت کے اصلی راز سے ناواقف رہے ہے۔ اگرچہ وہ اتہام وہابیت کے اٹھانے میں پوری قوت سے معرکہ آرا رہے ہے۔ لیکن خون شہید اپنی پاکیزگی میں آہوئے ختن کے خون سے بدرجہا زائد تھا۔ وہ عنصر مشک تھا جس کا نافہ آخرکار توڑا گیا۔

پوری ایک صدی گذر جانے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ دارالاسلام ہندوستان پر جب انگریزی حکومت نے تغلّب کیا تو سب سے پہلا کون شخص تھا جس نے قانونِ اسلام کی پابندی کرتے ہوئے ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کی کوشش کی

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ کے بابرکت اور مقدّس خاندان کے متعلق جس قدر کتب تاریخ و سوانح کی اوراق گردانی کی۔ کاتبِ حروف کے اس یقین میں اضافہ ہوتا رہا کہ اس مقدّس مگر خطرناک فریضہ کو اس مبارک خاندان نے اسی عزم و استقلال جرأت اور پامردی سے انجام دیا۔ جو حضرت سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثین کی شانِ عالی کے شایاں تھا۔

## حضرت شہید کا سلسلہ نسب

اصل مقصد کے آغاز سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شہید کی خاندانی عظمت اور سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز سے آپ کے نسبی واسطہ کا تعارف کرادیا جائے۔

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ کے چار فرزند تھے:۔

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز رح (۲) حضرت شاہ عبدالقادر رح (۳) حضرت شاہ رفیع الدین رح (۴) حضرت شاہ عبدالغنی رح۔

حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رح حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے۔ یعنی

حضرت شاہ ولی اللہ رح کے پوتے۔

اس خاندان کے دیگر ممتاز افراد یہ تھے:۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق رح۔ حضرت شاہ محمد یعقوب رح۔ حضرت شاہ مولانا عبدالحی رح۔ حضرت شاہ عبدالغنی رح۔

اس وقت صرف اس خاندانی رابطہ کو بیان کرنا مقصود تھا۔ جو حضرت شاہ اسمٰعیل اور حضرت شاہ ولی اللہ رح کے درمیان ہے۔ اس کے بعد ان خدمات کی مختصر فہرست پیش خدمت ہے۔ جو ورود برطانیہ کے بعد رزمگاہِ سیاست میں اس خاندان سے ظہور پذیر ہوئیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رح متوفی ۱۲۳۹ھ سب سے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"درین شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری ہست۔ و مراد از اجراء احکام کفر این ست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و عشور اموال تجارت، و سیاست قطاع الطریق و سراق و منصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند۔ آرے اگر بعض احکام اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نہ کنند نکردہ باشند۔ لیکن اصل الاصول این چیز ہا نزد ایشاں ہباؤ ہدر است۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مینمائند۔ و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد۔ برائے منفعت خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمائند۔ اعیان دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ جاری است۔

(فتاویٰ عزیزیہ ج ا ص ۱۷ مجتبائی)

مذکورہ بالا فتویٰ کے بعد دو فرض عام مسلمانوں اور بالخصوص علمائے کرام پر عائد ہوتے تھے:۔

(۱) جہاد ........ (۲) اگر ممکن نہ ہو تو ہجرت۔

چنانچہ حضرت سید احمد بریلوی و مولانا شاہ اسمٰعیل۔ حضرت مولانا عبدالحی وہ اکابر ہیں جنہوں نے اول فریضہ پر عمل کیا۔ اور جب کہ مشیت ایزدی نہ تھی کہ اہل ہند کی بدقسمتی پر حسن تدبیر کا غلبہ ہو سکے تو حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی شہادت کے بعد مولانا شاہ محمد اسحٰق رح و حضرت شاہ محمد یعقوبؒ رح نے جہادِ حریت (غدر ۱۸۵۷ء) سے تقریباً دس سال پیشتر یعنی ۱۲۶۲ھ میں اور شاہ عبدالغنی رح نے خاص جہادِ حریت یعنی (باصطلاحِ عوام غدر ۱۸۵۷ء) کے دوران میں ہجرت فرمائی رحمہم اللہ و رضی عنہم۔

(۱) سب سے پہلے ہندوستان کے متعلق دارالحرب کا فتویٰ دینے والے } حضرت سیدنا شاہ عبدالعزیزؒ

(۲) دارالحرب کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کرنے والے } حضرت سید احمد رح مولانا حضرت شاہ محمد اسمٰعیل۔

(۳) دارالحرب سے سب سے پہلے ہجرت کرنے والے } حضرت شاہ اسحٰق رح۔ حضرت شاہ یعقوبؒ۔

## حضرت شہید کے جہادِ عظیم کا مقصد

کسی انسان کی زندگی پر جو سب سے پہلے ظلم ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اُس کے جانفروشانہ کارنامہ کو مسخ کردیا جائے۔ اس کی قربانیوں کو کسی ایسے مقصد پر محمول کیا جائے جو اس کے مقدس عزم اور عالی حوصلہ کے برعکس ہو۔

حضرت شہید کے جہاد کا سب کو علم ہے۔ اور یہ بھی ہر مخالف و موافق جانتا ہے کہ حضرت شہیدؒ اسی جہاد میں کام آئے لیکن یہ کسی کو بھی یاد نہ رہا کہ حضرت شہید نے یہ جہاد کیوں کیا تھا؟ اور آپ کے

اور آپ کے پیر مرشد کی مساعیٔ جلیلہ کا مقصدِ اعظم کیا تھا؟ بلکہ پروپیگنڈے کی زبردست طاقت سے اصل حقیقت کو بالکل مخفی کر دیا گیا۔ اور ایسا گم کیا گیا کہ اب ہر ایک کو اس کا سمجھانا اور یقین دلانا بھی دشوار ہو گیا۔

بہر حال آج ہمیں اس گم شدہ اور فراموش کردہ حقیقت کے چہرہ سے نقاب اُٹھانا ہے۔ کہ حضرتِ شہید کے جہاد کا اصل مقصد سکھوں سے مظلوم مسلمانوں کا انتقام لینا یا اُن کے مقبوضات کو اسلامی حکومت کے زیرِ نگین کرنا ہی نہ تھا۔ بلکہ ان کے پیشِ نظر کل ہندوستان کا مسئلہ تھا۔ اور وہ اسی مقصد کے لئے سر بکف میدان میں آئے تھے کہ ہندوستان کو اعدائے اسلام کے ناپاک تسلط سے آزاد کر کے پھر سے اس کو دارالاسلام بنائیں۔ اگرچہ قلتِ فرصت کے باعث اس موضوع پر اس وقت کما حقہ، روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ مگر توقع ہے کہ اربابِ بصیرت اس مختصر بیان سے ہی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے لیکن اسکے بیان سے پیشتر ضرورت ہے کہ اس زمانہ کے سیاسی ماحول کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔

# حضرتِ شہید کا سیاسی ماحول

## سکھ، انگریز اور حضرتِ شہید

شاہ محمد اسمٰعیل نے ہوش سنبھالا تو انیسویں صدی عیسوی کا آغاز تھا۔ تقریباً پچاس سال گذر چکے تھے کہ انگریزوں نے پلاسی کے میدان کو ۱۷۵۷ء میں عیاری یا بہادری سے جیت کر بنگالہ میں قدم جما لئے تھے اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میر جعفر کو بنگال میں بے دست و پا کر کے اور میر قاسم کو صوبہ بہار میں شکست دیکر شاہزادہ عالی گوہر عرف شاہ عالم سے صوبہ بہار اور بنگال کی دیوانی بمعاوضہ ۲۱ لاکھ روپیہ

سالانہ حاصل کر چکے تھے جس کی رو سے الہ آباد سے بنگال و آسام کے آخری کنارے تک انگریزی تسلّط باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور پھر الٰہ آباد سے آگے بڑھتے ہوئے ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم بادشاہ دہلی سے وہ مضحکہ خیز معاہدہ بھی ہو چکا تھا جس سے گویا ہندوستان کے مسلمانوں کو عجیب طرح سے احمق بنایا گیا تھا جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر حملہ کیا۔ شاہ عالم کو گرفتار کر لیا۔ مگر غالبًا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کو قتل یا جلاوطن کر کے دہلی پر براہ راست قبضہ کر لیا جائے تو ہندوستانیوں میں وہ اشتعال پیدا ہو جائیگا جس کی روک تھام ناممکن ہوگی۔

لہٰذا انگریزی ڈپلومیسی کی دیرینہ روایات کی پوری پابندی کرتے ہوئے۔ زیر حراست اور مبتلائے قید و بند شاہ عالم کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا گیا تھا جس کی رُو سے شاہ دہلی کی حکومت کو دہلی شہر قلعہ اور اطرافِ دہلی تا قطب صاحب میں محدود کر کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کو اپنے ذمے لے لیا گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ حکومت کی زبان فارسی رہے گی۔ مسلمانوں کے قاضی اور ہندوؤں کے پنڈت اُن کے مقدمات فیصل کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ

اور پھر ۱۸۰۶ء میں شاہِ عالم کی وفات کے بعد جب اکبر ثانی تخت نشین ہوا تو جہاں پناہ ظلِّ سبحانی کو ان کے اختیارات سے اور بھی زیادہ سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ حدودِ مملکت بھی اب کانٹ چھانٹ کر صرف قلعہ اور شہر دہلی تک محدود کر دئیے گئے تھے۔

ممکن ہے عام ہندوستانی انگریزی معاہدات سے مطمئن ہوں۔ مگر خاندانِ ولی اللّٰہی کے ماہرین سیاست و فراست کسی طرح بھی مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں شاہ عبدالعزیز وہ فتویٰ صادر فرما چکے تھے جس کی کچھ عبارت پہلے گذری۔ جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا۔ کہ جب احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے ہندوستان پر اسی غرض سے حملہ کیا تھا کہ اسلامی سلطنت کو پھر زندہ کرے۔ لیکن حدودِ افغانستان پر ایران کی جانب سے بغاوت ہو جانے کے باعث (جس کو انگریزوں کی پالیسی بتایا جاتا ہے) اس کو بہت عجلت کے ساتھ لدھیانہ سے کابل واپس جانا پڑا۔ اسی دوا دوی میں وہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا گیا تھا۔ لیکن زمان شاہ کی وفات نے رنجیت سنگھ کو موقع دے دیا کہ وہ مستقل حکومت کا اعلان کرتے ہوئے سکھ حکومت کے حدود کو کابل تک وسیع کرے۔ چنانچہ پنجاب، ملتان، کشمیر، صوبہ سرحد کے تمام اضلاع رنجیت سنگھ کے زیرنگین ہو گئے۔ اور رنجیت سنگھ نے انگریزی سرکار سے صلح اور تعاون کا معاہدہ کر کے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی خود کو محفوظ کر لیا۔

جنوبی ہند میں اٹھارہویں صدی کے آخری نصف حصہ میں چار طاقتیں نمایاں رہیں۔

(۱) مرہٹے۔ جن کا مرکز احاطہ بمبئی تھا۔ صوبہ بمبئی، گجرات، صوبجات متوسط اور راجپوتانہ پر بھی اُن ہی کے تسلط کا پرچم لہراتا تھا جس سے گذر کر وہ اڑیسہ ہوتے ہوتے بنگال تک دھاوا بول دیتے تھے اور دوسری طرف دہلی کو تاراج کرتے تھے۔

(۲) فرانسیسی طاقت مدراس میں (۳) نظام حیدرآباد میں (۴) ٹیپو سلطان میسور میں۔

لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر تک یہ تمام طاقتیں شکست و ریخت ہو کر صرف ایک طاقت اس تمام علاقہ پر انا ولا غیری کا طبل بجانے لگی تھی۔ اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا انگریزی سرکار تھی۔

حدودِ ہند سے خارج یعنی افغانستان بھی انیسویں صدی کے آغاز میں یعنی زمان شاہ ابدالی کی

وفات کے کچھ عرصہ بعد خانہ جنگی کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ انگریزی اقتدار وہاں بھی کافی رسوخ حاصل کر چکا تھا۔ اسی طرح ایران بھی انگریزی اقتدار سے محفوظ نہیں تھا۔

الحاصل انگریزی حکومت نے ہندوستان کے تمام صوبوں پر مضبوطی سے قبضہ کر لیا تھا صرف پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، اور ملتان اس کے اقتدار سے خالی تھا۔ مگر اس پر سکھوں کے قبضہ نے شمال مغربی ہندوستان اور اس کے آس پاس کے مسلمانوں کی راہ بند کر دی تھی۔

مختصر یہ ہے کہ آسام سے لے کر حدودِ ایران تک مسلمان دو طاقتوں میں گھرے ہوئے تھے انگریز اور سکھ۔

## سکھوں کے مظالم کی داستان

اس میں شک نہیں کہ سکھ حکومت بھی مسلمانوں کے لئے کسی طرح اچھی نہ تھی کیونکہ یہ جماعت ڈیڑھ سو برس پیشتر سے مسلمانوں سے نبرد آزما رہی تھی۔ اور جب موقع پاتی تھی مسلمانوں کی تباہی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن مسلمان نتیجۃً غالب ہوتے رہتے تھے۔ اب مغلوب جماعت کا غلبہ یہ ایک دوسرا تصور تھا۔ جو مسلمانوں کی خودداری کو مشتعل کر سکتا تھا۔

لیکن بایں ہمہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رنجیت سنگھ کو زمان شاہ نے گورنری عطا فرمائی۔ اور اسی کی بدولت رنجیت سنگھ نے سلطنت قائم کی۔ مسلمانوں کے دشمن پر مسلمان بادشاہ کی اس نوازش کو اگرچہ دورِ حاضر کے مذاق کے لحاظ سے مسلم کشی سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن مسلمان سلاطین کی تسخیر کا طریقہ ہی یہ تھا۔ محمود اور بابر کے اصول کے بموجب وہ دشمن کو نوازشوں ہی سے رام کر لیا کرتے تھے۔

اگرچہ سات سو برس کی تاریخ عموماً ہندو راجاؤں کو غدار اور مکار ثابت کرتی رہی مگر مسلمان

بادشاہوں کی فطرت ہی یہ ہوگئی تھی کہ ؏

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

لہٰذا عقل و قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کے جبر و تشدد کی وہ کیفیت مسلمانوں کے ساتھ یقینًا نہ رہی ہوگی جس کا اندازہ اُس کی گذشتہ تاریخ سے ہو سکتا تھا۔

ہاں بیشک یہ مشہور ہے کہ سکھوں نے اذانیں بند کرا دیں۔ مساجد شہید کرا دیں۔ مگر افسوس کہ یہی شکایت شاہ عبدالعزیز رح کے الفاظ میں ہم اس زمانہ کی انگریزی سرکار کے متعلق بھی پاتے ہیں۔ فتویٰ عزیزیہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"زیرا کہ مساجد بے تکلف ہدم می نمایند"

علاوہ ازیں یہ ایک حقیقت ہے کہ چالیس سالہ سکھوں کی حکومت مسلمانوں کے مالی، اقتصادی، صنعتی اور تعلیمی وقار پر کچھ بھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ سکھوں کی حکومت کے اختتام کے بعد بھی انگریزی افسروں کی رپورٹوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

(الف) حکومت اس عرصہ میں اگرچہ سکھوں کی رہی مگر زمینداری مسلمانوں کی تھی۔ ہندو ان کے ہاں کارندوں کی طرح کام کرتے تھے (ملاحظہ ہو مسلمانوں کے افلاس کا علاج یعنی رپورٹ مرتب کردہ ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ ۱۹۳۳ء)

(ب) تعلیمی میدان پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ ہندوؤں کے بچوں کو مسلمان استادوں پر ہی اعتماد تھا اور وہ اُن کے پاس پڑھتے تھے۔ (حکومت خود اختیاری صہ ۹۹)

(ج) صنعت پر مسلمانوں کا قبضہ بدستور رہا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں مسلمان توپیں بناتے تھے

اور ان پر تاریخ اور ساخت کا سن عموماً فارسی میں ہوتا تھا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ پنجاب مصنفہ منشی عبدالکریم ص۱۴۱ تا ص۱۴۵)

(د) حکومت میں فارسی زبان کو برابر دخل رہا۔

(ہ) ۱۸۔فروری ۱۸۴۶ء کو سکھ حکومت کا انگریزوں سے معاہدہ ہوا تو گلاب سنگھ وزیر کی قیادت میں جس جماعت نے انگریزوں سے گفتگو کی اس میں منجملہ دس ارکان کے چار مسلمان تھے فقیر نورالدین، فقیر تاج الدین، فقیر چراغ الدین، سردار سلطان محمد خاں۔

(تاریخ پنجاب مصنفہ منشی عبدالکریم)

مگر انگریزی حکومت مسلمانوں کے حق میں سکھوں کے مقابلہ پر کیا حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

(الف) سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۶۹ء میں یعنی ۱۸۵۷ء سے صرف ۱۲ سال بعد بنگال کے متعلق لکھا تھا:۔

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو بھی تسلیم کرنا اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ حکام کے اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہو گا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی نوکری مل سکے" (مسلمانوں کے افلاس کا علاج ص۱۲۵)

(ب) پنجاب میں انگریزوں نے مسلمانوں کے متعلق کیا پالیسی اختیار کی اُس کی توضیح کے لئے ہم صرف ایک نقل پیش کرتے ہیں (خان بہادر خورشید احمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کا بیان ہے)

"اس کے بعد ایک طرف تو مسلم استادوں کی تعداد تعلیم عامہ کے صیغہ میں گھٹائی گئی۔ دوسری طرف جو انگریزی اسکول اضلاع کے صدر مقامات میں قائم کئے گئے وہ بالکل غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دیئے گئے۔ یہ پالیسی اس قدر کامیاب ہوئی کہ پچیس سال کے عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے اور تعلیم سے مسلمانوں کا عنصر بالکل خارج ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۸ء تک کے نقشوں سے واضح ہوتا ہے کہ معائنہ کنندگان اور استاد سب کے سب ایک مذہب کے لوگ یعنی ہندو تھے کبھی کبھی کسی مسلمان کا نام جو شاذو نادر آتا وہ اس لئے کہ اس وقت صوبہ سرحد بھی پنجاب کے تحت میں تھا۔ اور ہندو استاد وہاں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے مسلمان وہاں بھیجے جاتے تھے۔

پنجاب کے بعد بنگال وہ صوبہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مگر لہٰذا ہر اسی قسم کی ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۱ء میں گورنمنٹ کی چٹھی کے بموجب کل ۱۳۹۲ استادوں میں سے صرف چھبیس مسلمان تھے۔ ۴۶ ڈپٹی انسپکٹروں میں سے صرف دو مسلمان۔ ۱۹۰ سب ڈپٹی انسپکٹروں میں سے صرف ۹ مسلمان۔ (مسلمانوں کے افلاس کا علاج ص۱۷)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو حضرت شہید کی شہادت سے پچاس سال بعد کے انقلابات ہیں حضرت شہید پچاس سال قبل کیسے اندازہ کر سکتے تھے کہ انگریزی حکومت کے نتائج کیا ہونگے۔ اور یہ کہ سکھ حکومت بہتر ہے یا انگریزی حکومت؟ جواب اول تو یہ ہے کہ سیاسی مفکّر کے لئے درحقیقت پچاس پچاس سال یا بعد کا عرصہ گویا آج کا دن ہوتا ہے۔ بلا شبہ عام آدمی قیاس میں بہت کچھ غلطیاں کرتے ہیں لیکن صحیح الرائے مفکّر کے قیاسات واقعات کا چربہ ہوا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت شہید نے جہاد سے پیشتر ہندوستان کی سیاحت فرمائی تھی۔ آپ کلکتہ اور بنگال تشریف لے گئے۔ وہاں

ایک عرصہ قیام فرمایا تھا۔ بنگال کی حالت بدیہی طور پر انگریزی ذہنیت کا نقشہ تھی اور انگریزی حکومت کے نتائج کو بہ بانگ دہل بیان کر رہی تھی۔

بنگال کی حالت اس زمانہ میں کس حد تک پہنچ گئی تھی اس کا اندازہ ان سینکڑوں شہادتوں سے ہو سکتا ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے متعلق خود انگریزوں نے موقعہ بموقعہ پیش کیں مثلاً لارڈ میکالے نے لکھا ہے :۔

اس طریقہ سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہو گئی۔ درانحالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد کر دیئے گئے۔ بیشک ہندوستانیوں کو مظالم سہنے کی عادت تھی مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے۔

کمپنی کے لوگوں کی چھوٹی انگلی (بنگالیوں کو) سراج الدولہ کے پٹھے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی۔

پرانے حکام کے زمانہ میں ان کے ہاتھ میں ایک علاج تھا۔ وہ یہ کہ جب ظلم ناقابل برداشت ہو جاتا تو وہ بغاوت کر کے حکومت کو توڑ دیتے تھے۔ مگر انگریزی حکومت ہلائے نہیں ہل سکتی تھی۔ یہ حکومت وحشیوں کی سی حد درجہ ظالمانہ حکومت ہونے کے ساتھ جدید تہذیب کے آلات سے مضبوط تھی۔

(حکومت خود اختیاری ص۹)

اس سلسلہ میں لارڈ کلایو نے یہ لکھا ہے :۔

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر بدعملی رشوت خواری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کسی

ملک میں دیکھا یا سنا نہیں گیا۔

(حکومت خود اختیاری ص۱)

یہی زمانہ وہ تھا جس میں پادریوں کا بنگال میں کافی زور رہا حتیٰ کہ انجیل کو سکولوں کے کورس میں داخل کر دیا گیا۔ جو درحقیقت انگریزی زبان سے مسلمانوں کی نفرت اور پھر اُن کے تعلیمی انحطاط کا باعث ہوا۔ بہرحال حضرت شاہ صاحب جیسے مفکرِ جلیل اور مدبرِ اعظم کو چشم دید واقعات کے بعد کیا یہ ممکن تھا کہ سکھ حکومت اور انگریزی حکومت میں امتیاز کو محسوس کر لیتے۔ اور بالخصوص جب کہ حضرت شاہ عبدالعزیز اس عہد کے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔

## مجاہدانہ سرگرمیوں کا مقصد

حضرتِ شہید کی شہادت تو مسلّم چیز ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ سکھوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے آپ نے تمنائے شہادت میں کامیابی حاصل کی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آپ نے سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے ہی مجاہدین کو فراہم کیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی اس جدوجہد کا مقصد صرف سکھوں سے مقابلہ اور پنجاب ہی کو آزاد کرنا تھا کہ اس کے علاوہ آپ کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی لیکن ان مسلمات کے باوجود احقر کا خیال یہ ہے کہ حضرتِ شہید کی تمام مساعی عام استیلاء ملت اور بالخصوص انگریزوں سے جہادِ حق اور استخلاصِ وطن کے لئے تھیں۔ آپ چاہتے تھے کہ ہندوستان پھر سے دارالاسلام بن جائے۔ ہم کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اپنے استاد اور عمِ محترم اور شیخ الشیخ (دادا پیر) حضرت شاہ عبدالعزیز کے اس فتوے کے برخلاف کوئی رائے رکھتے تھے۔ ہمارا یقین

ہے کہ حضرت شہید اور حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہما کی جملہ مساعی حضرت شاہ عبد العزیز کے فتوے پر عمل تھا۔ اور جب یہ دونوں حضرات شہید ہو گئے اور جہاد کی توقع منقطع ہو گئی تو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے پر دوسرا عمل یہ تھا کہ حضرت مولانا شاہ اسحٰقؒ اور آپ کے رفقا ہندوستان سے ہجرت فرما گئے۔ ہمارے اس یقین کی تائید خود حضرت اسمٰعیل شہید کے مندرجہ ذیل کلمات سے ہوتی ہے:۔

"قیام سلطنت ارتداد بمشابہ غلبۂ کفار است کہ بر ذمہ مسلمین فرض عین می شود کہ بر جہاد قائم بگردانند و ایں شورش و فساد بشمشیر بنشانند و اگر نتوانند ازاں اقلیم ہجرت نمایند و بدار الاسلام فرود آیند۔
(منصب امامت ص۹۸)

## انگریزوں کی بجائے سکھوں پر حملہ

سوال یہ ہے کہ جب مقصود جہاد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا بھی تھا تو پھر انگریزوں پر حملہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اور صرف سکھوں سے جنگ کے بہانہ طاقت کیوں فراہم کی گئی اور محض انہی سے جنگ کیوں ہوئی؟

لیکن جو شخص ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحرب خدعۃ (جنگ مخفی تدبیر ہے) سے واقف ہے۔ اس کے لئے یہ سوال یقیناً بادر ہوا ہے۔ جہاد کے لئے سب سے مقدم ضرورت پناہ گاہ کی ہوتی ہے۔ جہاں مجاہدین فرار ہو کر بھی مامون ہو سکیں۔ ہندوستان کے تمام اطراف و ممالک میں مسلمان مجاہدین کے لئے سب سے بہتر پناہ گاہ صوبہ سرحد کا پہاڑی علاقہ ہے۔ یہی جگہ ہندوستان اور دنیا کے تمام اسلامی ممالک کا مرکز اتصال ہے۔ اور ہندوستان کے تمام فاتح اسی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور

یہی علاقہ قدرت کا وہ محفوظ قلعہ ہے کہ اس پر اگر پوری طرح تسلط ہو جائے تو تمام ہندوستان میں انقلاب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مقام پر قابو پا لینے کے بعد دہلی تک پہنچنے کے لئے صوبہ پنجاب راستہ میں پڑتا ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ سکھ حکومت اگر راستہ دینے پر آمادہ ہو جاتی تو سکھوں کے بجائے حضرت شہید کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوتا۔ واللہ اعلم

مگر انگریزی ڈپلومیسی کا یہ عجیب و غریب کرشمہ تھا کہ یہاں سے تو حضرت شہید کے لئے سکھوں پر حملہ کرنے کی سہولتیں پیدا کیں۔ اور پھر سکھ حکومت انگریزوں سے معاہدہ کے باعث مجبور تھی کہ حضرت شہید کو راستہ نہ دیتی اور جب حضرت شہید کی جمعیت ایک لاکھ سے متجاوز ہونے لگی تو آپ کی جمعیت میں عقائد کے متعلق اختلاف پیدا ہوگیا، یا کرا دیا گیا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ سکھ حکومت نے کچھ سرحدیوں کو روپیہ دے کر حضرت شہید کی فوج میں تفریق پیدا کر دی جو شکست کا باعث ہوئی نہیں کہا جاسکتا کہ تفریق کا باعث سکھ حکومت ہی تھی یا جس طاقت نے زمان شاہ کے ہندوستان میں حملہ آور ہونے کے وقت کئی لاکھ روپیہ خرچ کر کے اس کی ایرانی سرحد پر بغاوت کرائی تھی۔ وہی پوشیدہ ہاتھ یہاں بھی کارفرما تھا۔ بہرحال جہاد کے لئے اس وقت یہی تدبیر کامیاب ہو سکتی تھی کہ سرحدی کوہستان کو پناہ گاہ قرار دے کر پنجاب کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ کیا جاوے۔

بلاشبہ حضرت شہید کی شہادت سے کامیابی ناکامی میں بدل گئی۔ مگر کوہستان کا علاقہ عرصہ تک حضرت شہید کے پس ماندہ مجاہدین کی پناہ گاہ بنا رہا۔ چنانچہ سکھوں کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی اُن مجاہدین کے حملے انگریزی افواج اور علاقوں پر ہوتے رہے۔ حتّٰی کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کے پانچ سال بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں لارڈ الگن کے زمانہ میں وہ معرکہ پیش آیا جس کو "وہابیوں کی جنگ" سے

موسوم کیا جاتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت شہید کے ہمنوا حضرات کے لئے وہابی کے خطاب کا منشا اور مخرج کیا ہے۔

یہ تھا سیدنا اسمٰعیل شہید رح کے مساعیٔ جلیلہ اور مجاہداتِ عظیمہ کا مقصدِ مبارک۔ خدا کے ہاں اس سے سوال نہ ہوگا کہ مقصد میں کامیابی ہوئی یا ناکامی۔ خدا کے ہاں حضرتِ شہید کی وہ قربانیاں مقبول ہونگی جو آپ نے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے پیش کیں۔ العظمۃ للّٰہ اس مقدس جماعت کی جفاکشی بذاتِ خود حیرت انگیز ہے جو ایک مفکّر کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ خیال فرمایئے صوبہ سرحد تک حضرت شاہ صاحب اور آپ کی جماعت کا پہنچنا کس قدر دہشتناک ہے۔

سہارنپور کے ضلع سے گذر کر ہمالیہ کا دامن شروع ہوتا ہے۔ جو ہولناک پہاڑیوں کی شکل میں پنجاب کی شمالی سرحد سے ٹکراتا ہوا کشمیر سے گزر کر صُوبہ سرحد کے کوہستان سے جا ملتا ہے۔ سینکڑوں میل کا پہاڑی علاقہ ہے جس کا ایک میل طے کرنا بھی مشکل ہے۔ آج ہمارے لیڈر اگر تھرڈ کلاس میں سفر کر لیتے ہیں تو اپنی قربانی کے بلند بانگ دعوے سے چاہتے ہیں کہ تمام دنیا کو سر پر اٹھا لیں۔ لیکن قربانی یہ ہے کہ ایک مقدس جماعت بے یار و مددگار چلتی ہے۔ نہ اس کے پاس جنگی سامان قابلِ اطمینان ہے نہ سامانِ رسد بقدرِ ضرورت ہے۔ فاقوں پر فاقے ہیں پاؤں ہیں چھالے مگر نظر مقصد پر جمی ہوئی ہے۔ اولاد کو چھوڑا، اہل و عیال کو خیرباد کہا، وطنِ عزیز کے عیش و آرام پہ لات ماری۔ ایک مقصد سامنے ہے اور اس پر سب کچھ قربان! سبحان اللّٰہ و العظمۃ للّٰہ۔

# شاہِ شہید کی آخری آرامگاہ

خواجہ عبدالوحید
سکرٹری
اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور

جو لوگ ایبٹ آباد کے راستہ کشمیر گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مانسہرہ سے قریباً ۲۴ میل آگے اور گڑھی حبیب اللہ سے قریباً ایک میل ادھر ایک بہت بڑا پہاڑی نالہ بہتا ہے۔ جو تھوڑی دور جاکر دریائے کنہار یا نین سکھ میں جا ملتا ہے۔ کشمیر کی سڑک اس نالہ میں سے ہو کر گذرتی ہے

اگر گڑھی حبیب اللہ کے راستہ کو چھوڑ کر پہاڑی نالہ کے بائیں کنارے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلے جائیں تو تھوڑی دور جاکر آپ دریائے کنہار کی وادی میں پہنچ جائیں گے۔ اس وادی کے درمیان دریا کے متوازی ایک پختہ سڑک چلی گئی ہے۔ یہ سڑک جو کبھی دریا کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے اور کبھی اس سے بہت بلند۔ ایک ایسے خوبصورت۔ اور سرسبز و شاداب علاقہ میں سے گذرتی ہے جس کی مثال ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بہت کم ملے گی۔ بالخصوص برسات کے موسم میں جب کہ ہر طرف سے برساتی نالے گر رہے ہوں اور جگہ جگہ پانی کی روانی جاذب نظر ہو رہی ہو اس کوہستانی منظر کی دلکشی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اس راستہ پر اگر دریائے کنہار کے بائیں کنارے کنارے اوپر کی جانب چلے جائیں تو بارہ چودہ میل کا پُرلطف اور پُرفضا فاصلہ طے کرنے کے بعد ضلع ہزارہ کا وہ تاریخی مقام نظر آتا ہے

جسے بالاکوٹ کہتے ہیں۔ اور جس کا چپّہ چپّہ ہندوستان کے آخری مسلمان مجاہدین کے پاکیزہ خون سے رنگین ہوچکا ہے۔ اور جہاں تاریخ ہند کے عہدِ اسلامی کی چند عدیم النظیر ہستیاں محوِ استراحت ہیں۔ بالاکوٹ کے مقام پر دریا کے پار جانے کے لئے ایک پل موجود ہے۔ اس پل کو پار کرکے آپ وادیٔ کاغان میں داخل ہوجائیں گے۔

بالاکوٹ کا مقام ایک بہت ہی پرفضا مقام ہے اور اس کے گرد چاروں طرف فلک بوس پہاڑ اس کی حفاظت کررہے ہیں۔ ایک طرف کنہار ایسا خوفناک دریا جو بلندی سے نشیب کی طرف بڑی تیزی سے گرتا چلا آتا ہے۔ بالاکوٹ کی محافظت کا فرض ادا کررہا ہے اور دوسری طرف کوہستانِ ہزارہ کی عظیم الشان چوٹیاں جن میں سے بعض تیرہ تیرہ چودہ چودہ ہزار فٹ بلند ہیں باہر سے آنے والوں کا راستہ روکے کھڑی ہیں۔ اور آج اس بیسویں صدی میں بھی ایک ہی سڑک جو دریا کے کنارے کنارے یہاں تک چلی گئی ہے اگر توڑ دی جائے تو باہر سے اس مقام پر پہنچنا محال ہے۔

یہی بالاکوٹ کا مقام تھا۔ جہاں ۱۲۴۶ھ میں ہندوستان کے وہ مجاہدین اعظم سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تعالیٰ پشاور اور اس کے گرد و نواح کے نام نہاد مسلمانوں کی غدّاری سے تنگ آکر اور مجبور ہو کر پناہ گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں یہ مقام آج کے مقابلہ میں بہت زیادہ محفوظ تھا اور سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل تھا کہ وہ یکسوئی سے یہاں بیٹھ کر مجاہدین کی ازسرِ نو تنظیم فرماسکیں گے۔ اس مقام کے محفوظ ہونے کے متعلق مجاہدین کی جماعت کسی حد تک مطمئن تھی۔ اس کا اندازہ سید صاحب کے

ایک خط کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے جو آخری معرکۂ کارزار و شہادت سے صرف گیارہ روز پیشتر لکھا گیا تھا۔ سیّد صاحب فرماتے ہیں:۔

"فی الحال بالاکوٹ کے قصبہ میں کہ اس کے دروں میں سے ایک درّہ میں واقع ہے جمعیتِ خاطر کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں اور کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلہ کے لئے تین چار کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن چونکہ مقام مذکور نہایت محفوظ ہے لشکرِ مخالف خدا کے فضل سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔"

مذکورہ بالا الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں، کہ باوجود اس بات کے کہ کفّار کا لشکر تین چار کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا مجاہدین کی جماعت اپنے آپ کو بالکل محفوظ پاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بالاکوٹ کے مقام تک پہنچنے کا جو پہاڑی راستہ تھا اس کو گھنے جنگلوں نے ناواقفوں کی نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔ خود اس علاقہ کے رہنے والے خاص خاص لوگ ہی اس راستہ سے واقف تھے

سکھ فوج کے کمانڈر راجہ شیر سنگھ نے کئی روز کی ناکام کوشش کے بعد بالاکوٹ کے مقام تک پہنچنے کی امید توڑ دی۔ اور وہ اپنا رُخ کسی دوسری جانب پھیرنے پر مجبور ہو گیا عین اس موقع پر کسی مسلمان نے اسے بالاکوٹ کے اس خفیہ راستہ سے آگاہ کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ عالمِ بے خبری میں مجاہدین کے سروں پر سکھوں کا ٹڈی دل منڈلانے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے بالاکوٹ کی سرزمین پر دشمنِ اسلام فوج پھیل گئی۔

سکھوں کی فوج کو مجاہدینِ اسلام کے مختصر گروہ تک پہنچانے والے کون تھے۔ یہی

اسلام کے نام لیوا جن کے دل اسلام سے بیزار تھے لیکن جن کی زبانیں اسلام کا نام لے رہی تھیں۔
اسلام کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا موقع نہ تھا۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خون بہانے والی تلوار بھی ایک
کلمہ گو کے ہاتھ میں تھی۔ اور جناب امیر علیہ السلام کا خون بھی بہا تو ایک کلمہ گو کے ہاتھ سے۔ کربلا
کے میدان میں اہلِ بیت کے جسمہائے اطہر کو زخموں سے چور کرنے کے لئے کلمہ گوؤں کی تلواروں
ہی نے کام کیا۔ اور تیرھویں صدی ہجری کے مجاہدینِ اسلام کے سینوں پر گولیاں اور تلواریں چلانے
میں بھی انہیں نام نہاد مسلمانوں کو وسیلہ بنایا گیا۔ بالاکوٹ کے در و دیوار کوہ و دریا شجر اور حجر سب
اس المناک افسانے کو آج بھی دہرا رہے ہیں۔ بالاکوٹ کی زمین اور وہاں کا آسمان شہادت
دیتے ہیں کہ دشمنانِ دین کو محبانِ دین کے سروں پر لا کھڑا کرنے کا فریضہ ادا کرنے والا اسلام کے نام نہاد
نام لیواؤں ہی کا ایک گروہ تھا۔

یہ جماعت جو ہمیشہ اسلام کا نام لے کر اسلام کی تباہی کے درپے رہا کرتی ہے قرآن کی
اصطلاح میں منافقین کی جماعت کہلاتی ہے۔ اس جماعت نے ہمیشہ دنیائے اسلام کو تباہ کرنے
میں دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیا۔ اور اسی لئے کفار کو اگر "عذابِ عظیم" کی بشارت دی گئی تو انہیں
"عذابِ الیم" کا مستحق قرار دیا گیا۔ اگر اسلام کے کھلے دشمنوں کو "جہنم کا حق دار بنایا گیا تو ان چھپے
دشمنوں کو درک الاسفل من النار کے ٹھکانے کی خوشخبری دی گئی۔

"تاریخ کے مطالعے سے اگر سبق حاصل نہ کیا جائے تو وہ مطالعہ بے کار ہے۔ ماضی کی روشنی
میں حال کو سمجھنا اور مستقبل کو خوشگوار بنانا ہی مطالعۂ تاریخ کا مقصد ہے۔ بالاکوٹ میں جو کچھ ہوا
اس افسانہ کو دہرانا محض اس لئے ضروری نہیں ہے کہ ایک محفلِ عزا برپا کر کے اپنی عقیدت کا

اظہار کر لیا جائے۔ بلکہ یہ مقصود ہونا چاہیئے کہ ہم اس سے اپنے لئے کوئی راہِ عمل پیدا کریں۔ بالاکوٹ کے گرد و نواح کے منافقوں نے اگر غداری کی تو مجاہدین کا کچھ نہ بگڑا۔ اس لئے کہ وہ تو کامیاب و کامران ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ اگر اس دنیا کی فانی زندگی کو کھو گئے تو کیا ہوا انہیں اپنے رب کے ہاں ابدی زندگی حاصل ہو گئی۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ○ (البقرہ ۱۵۴)

وہ اگر اس دنیا کی مادی نعمتوں سے محروم ہو گئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ انہیں خالق ارض و سما کے حضور میں ابدی نعمتیں حاصل ہو گئیں۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ط بل احیاء عند ربھم یرزقون ○ فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ○ یستبشرون بنعمۃ من اللہ وفضل و ان اللہ لا یضیع اجر المومنین ○ (آل عمران ۱۷۰-۱۷۱)

نقصان اگر ہوا تو بعد میں آنے والوں کا۔ جو غلامی کی ذلیل زندگی میں ایسی بری طرح پھنس گئے کہ پھر ایک صدی گذر جانے پر بھی آزادی کی خواہش اُن کے دلوں میں عمل کا جذبہ نہ پیدا کر سکی۔

بالاکوٹ کے مقام کی جغرافیائی کیفیت اس کے اندر حفاظت و استحکام کے تمام سامان بہم پہنچا رہی تھی۔ فلک بوس پہاڑ، تیز رفتار دریا، گھنے جنگل اور اشجار و احجار سب کے

سب مجاہدین کی حفاظت کے لئے کافی تھے۔ لیکن قدرت کے یہ تمام سامان انہیں منافقین کی ریشہ دوانیوں سے نہ بچا سکے۔ اس ایک امر واقعہ کے متعلق آج کے مسلمانوں کے لئے عبرتوں کے خزانے موجود ہیں، جس قوم کا اپنا کیریکٹر ذلیل ہو جس قوم کے اپنے افراد کو دوسرے خرید سکتے ہوں، جس قوم کے دل و دماغ اپنی تعمیر کی بجائے دشمنوں کے گھر بنانے میں کام آتے ہوں جس قوم کے نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی قوتیں غیروں کی طاقت بڑھا رہی ہوں ایسی ظالم قوم کو تباہی و ہلاکت سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اگر بالاکوٹ کا قدرتی ماحول تمام حفاظتی سروسامان کے باوجود مجاہدین کی جماعت کو دشمنوں سے نہ بچا سکا تو آج ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان جو اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنے پر آمادہ نہیں جو خود خدا کے دین کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں جن کے دل اسلام کے قانون سے متنفر اور جن کی زبانیں اسلام کی اطاعت سے یکسر انکاری ہیں ان کو کس طرح رعایات و حقوق کا قانونی تحفّظ زندگی بخش سکتا ہے۔

بالاکوٹ کی سرزمین پر جو کچھ ہوا۔ وہ منظر چشم فلک نے احد کے میدان میں بھی دیکھا تھا۔ اس میدان میں مسلمانوں کو ہر طرح کا سروسامان حاصل تھا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ معرکۂ کارزار میں دادِ شجاعت دینے آئے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے درمیان دنیا کے سب سے اولوالعزم نبی کی ذات بابرکات موجود تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نتیجہ مسلمانوں کے حق میں نہ نکلا۔ مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی اور وہ اس بدحواسی کے ساتھ میدان سے بھاگے کہ قرآن کی شہادت یہ کہہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چلّا چلّا کر پکار رہے تھے لیکن وہ مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی مسلمانوں کا اندرونی اختلاف۔ اور نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی۔ بالاکوٹ میں بھی یہی ہوا۔ قدرت نے ہر طرف سے

تحفظ اور امن و امان کا سرو سامان بہم پہنچا رکھا تھا۔ مجاہدین کا گروہ جانیں دینے پر آمادہ تھا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ہر ہر مجاہد نے خوب دادِ شجاعت دی۔ اُس وقت کا سب سے بڑا انسان بنفسِ نفیس موجود تھا۔ اس کی شجاعت بھی کار فرما تھی۔ اور اس کی رُوحانیت بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک طرف اور بالاکوٹ کے ایک یا چند نام نہاد مسلمانوں کی غداری ایک طرف۔ اول الذکر تمام سازوسامان ثانی الذکر خباثت کے تباہ کن اثرات کو زائل کرنے سے یک قلم قاصر رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کا ملک جہاں فرزندانِ اسلام نے کم و بیش سات سو برس عظیم الشان فرمانروائی کی تھی ایک نامعلوم عرصہ کے لئے عزت و حکومت سے بالکل محروم ہو گیا۔

مجاہدین کا یہ گروہ جس کی قیادت سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک ہاتھوں میں تھی ماہ رجب ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ میں داخل ہوا تھا اور ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کے روز آخری معرکہ کارزار گرم ہوا۔ مجاہدین شیرانہ جرات سے کثیر التعداد دشمن سے لڑے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی جامِ شہادت نوش فرمایا معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سکھ سردار فوج نے سید صاحب اور شاہ صاحب کی لاشوں کو شناخت کرا کے بالاکوٹ ہی کے ماحول میں سپردِ خاک کر دیا۔ آج جب کہ انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک صدی سے اوپر عرصہ گذر چکا ہے۔ دنیا ان شہیدانِ حق کے کارناموں کو یاد کر رہی ہے اور جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا ہندوستان کے ان آخری مجاہدینِ اسلام کی یاد احساس رکھنے والے مسلمانوں کے لئے سرمایۂ عبرت بہم پہنچاتی رہے گی۔ بالاکوٹ کے مقام کو دیکھنے والا شخص آج بھی اس کے درودیوار اور کوہ و دریا سے ان مجاہدین کے کارناموں کا افسانہ سُن سکتا ہے۔ آج

بھی بالاکوٹ کی خاک سے اہلیت رکھنے والوں کو انوارِ روحانیت نکلتے نظر آئیں گے۔ بالاکوٹ کا
منظر چشمِ بصیرت رکھنے والوں کو بتا رہا ہے کہ گو قدرت نے مجاہدین اسلام کے لئے ہر طرح کا ساز و
سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ تاہم مسلمانانِ ہزارہ کی غداری اور اسلام دشمنی نے اسلام کے چراغ کو بجھا
دینے کی پوری کوشش کی، لیکن یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم
نورہ ولو کرہ المشرکون

مسلمان یا نام نہاد مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے اور اسلام سے لب و لہجہ اختیار کرنے
والے مسلمان مٹ سکتے ہیں لیکن اسلام خدا کا ازلی و ابدی پیغام کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اس کا نام
روشن کرنے والی مجاہدین کی جماعت ہے جو خود مٹ کر اسلام کا نام اُچھال جاتی ہے۔ ایسے ہی
پاکباز مجاہدوں کی مبارک نعشیں بالاکوٹ کے مقام پر دفن ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس خاکِ
پاک کو دیکھ کر اپنے لئے سرمایۂ عبرت حاصل کر لیں۔ اور خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو شہیدانِ راہِ
حق کی مبارک سوانحِ حیات سے اپنے لئے زندگی کا کوئی مفید سبق اخذ کر لیں۔

aspire to power, prestige and progress as the great Himalayas suggest.

> "He defended the Islamic Faith with the courage that a lion gathers to defend its cubs, and in the expression of truth he cared neither for a javelin nor for an arrow."

Kandhar and thence proceeded to Kabul, ultimately entering the Punjab through the Khyber Pass. They were engaged in many a skirmish, and sent messages to Bukhara, Badakhshan and Kashghar. After considerable success, Sayyid Ahmad decided to retire into the Kashmir mountains, owing to the disloyalty of some Muslims. He was on his way chased by the Sikhs to Balakot where he had guarded himself. A deadly conflict took place there, and the Muslim fighters in the name of Allah met the enemy with traditional martial courage. The corpses of Sayyid Ahmad and Shah Ismail were discovered amongst the slain. Such is the chivalrous end of the two great Muslims who guided by a burning desire to exalt the name of Allah and to elevate the condition of His people from a quagmire of degradation and ignorance laid their lives at the altar of sacrifice.

Nadir Shah came, plundered and went away. Ahmad Shah Abdali broke the rising Hindu power and went back; but the Mughal was weakened as a consequence, although men like Nawab Abd-us-Samad had done much to keep the situation well in hand, but they were political men; the Sayyids were, on the other hand, guided by the torch of Islam and in the height of their ideals and freshness of ideas, they have left for the present generation a precious heritage. While circumstances have changed and new problems have arisen, Ismail Shahid beckons us from the secluded heights of Balakot to rise above the low and narrow view of life and

battle-field as a full-fledged soldier of unusual character. It appears that in Ismail Shahid the deteriorated spirit of the Indian Muslim was trying to recoup its health. Surely that was the way to adapt himself to circumstances and to rise up to great adventures. Not only did the poor Mughals lose the empire, but their physical health also gave way because they forgot the evil influence of the Indian climate and circumstances, that something indescribable which paralysed through the ages the great dynasties that came to rule this vast sub-continent. Ismail Shahid was manifestly learning to protest against the circumstances. He also assumed full control over his own self, when, as his biographers tell us, he could sleep and wake at will, a fact which shows that the great man first became the master of his own little state of the self, as Aristotle calls it, and was then inspired to secure control of the bigger political state.

As the ground had been prepared by Shah Waliullah and Shah Abdul Aziz, Syed Ismail first diverted his attention to the reform of Muslim society and was opposed even by Maulvi Fazl-ul-Haq, an eminent man of letters of the day, and the matter was brought to the notice of Akbar Shah. A far nobler part was played by Sayyid Ismail Shahid, the right hand man of Sayyid Ahmad of Bareilly, in the story of Jihad of the latter's followers during the twenties of the 19th century on the North-Western Frontier. As a group they passed through Southern Punjab, reached

fore as leaders of the nation.

The two great Sayyids who set before themselves a gigantic task inspired by a new vision have a history of their own, which is as stirring as the story of adventures of any great military genius, but it is a closed book consigned to a secluded shelf, and Muslim India has not yet realized its actual significance. The life events of the Sayyids are intertwined, but herein we are concerned only with the character and exploits of Ismail the Martyr, who with great courage, vigour and lofty ideals has shown us the way to the glory of self-sacrifice. Shah Ismail Shahid, as he is called, was the grandson of Shah Wali Ullah, the famous Traditionist, born in 1778 A.D. in Delhi and was the dearly beloved nephew of Shah Abdul Aziz. As a boy he showed signs of a great future, and was particularly noted for sharp memory and taste for books. He soon acquired a good standard of education with a fair introduction to philosophy, mathematics and geography, which subjects, unfortunately, are not cared for by the present-day maktabs. He was at the same time interested in horse-riding, tent-pegging, swordsmanship, archery, fencing and many other arts of physical culture. He was a great expert in swimming, and it is said that he used to swim from Delhi to Agra and back to Delhi in the river Jamna. He was also accustomed to acquiring immunity to hardships ; for instance he walked bare-foot on the sun-scorched floor and exposed his body to the sun for hours, which practices were to enable him to go to the

Towards the close of the eighteenth century the political horizon of India was full of smoke and confusion. Only a few decades before, Nadir's invasion had left the Mughal ruler broken and India half desolate. The political affairs of the country had become more intricate owing to the mental and spiritual degradation of the Indian Muslims, a direct result of power and pelf, with the least care to exploit the fabulous wealth of India for constructive purposes of life.

The history of the post-Mughal period, dark and dismal as it is in its significance, is not singularly devoid of such men as cared about Islam and Muslims. The name of Shah Waliullah is one which alone shows that the progress and growth of Muslim culture had not been entirely extinguished. The idea of reconstruction of society or re-capture of power got further strength when Sayyid Ahmad (born 1786 A.D.), of Rae Bareilly, who was a religious disciple of Shah Abdul Aziz of Delhi, and Shah Ismail Shahid of Delhi (born 1778 A.D.) rose to grasp the new meaning of life, that is to gain control over circumstances and wrest political power, the basis of all reconstruction. It appears from the life events of the two Sayyids that they were motivated by a hope that Islamic faith and history of this great religion impart to its followers. It was a noble effort that they made to replenish the exhausted reservoir of energy as Islam is wont to do through inspiration of those who come to the

# A DEFENDER OF THE FAITH

*by*

MIRZA ABDULLAH ANWAR BEG
*M.A., LL.B.*
*Advocate, High Court, Lahore*

combine in a single personality. He had no love for riches or fame. He was a true servant of God. He wanted to raise the banner of Allah, and submission to the will of God in him was so great that when his head was cut off every drop of blood that fell was crying : –

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

proceed to the N. W. F. Province and thus set up a large and powerful Moslem bloc, and after this they could go ahead with their Islamic ideal without resistance and opposition. Secondly, the tyranny and oppression of Raja Ranjit Singh had created a great stir and commotion among the Moslems of the Punjab, where religion and traditions were in danger. Shah Shaheed and his party were long watching for an opportunity to throw a spark into the magazine. They took advantage of this uprising and declared a crusade against Raja Ranjit Singh. By his firmness and patience, valour and intrepidity in the battlefield, Hazrat Shaheed revived the memories of Hazrat Khalid bin Waleed, Haidar-i-Karrar and Tariq bin Ziad. At many places he won victories. But unfortunately fate had something else in store for him. The misfortunes of the Moslems were not over. They had more hardships and sufferings to pass through. And hence this Islamic campaign also met with the same fate as those of Sultan Tipu in Mysore and Siraj-ud-Daula in Bengal, and the causes of failure were everywhere the same.

Victory and defeat are things of destiny, and God alone knows what was hidden in the defeat. But if you cast a glance on the splendid efforts of Hazrat Shaheed, you will not find in the whole history of Moslem India a greater hero of the nation. On the one hand he was fighting against the moral evils of his age with his pen and tongue, and on the other he was riding in the battlefield with a naked sword. Such sterling qualities seldom

### *Intuition and knowledge of divine things*

Meanwhile he became the disciple of Hazrat Shaheed Maulana Syed Ahmad Saheb Brelvi. At that time he was the acknowledged Imam of theosophy, revelation and knowledge of divine things. Shah Shaheed sat at his feet and traversed the various stages of spiritualism under his guidance and soon attained perfection in the occult science too.

### *The Crusade and Martyrdom*

At last the time arrived when the climax of the efforts was reached. With his spiritual teacher he went to the Punjab and started a crusade against Raja Ranjit Singh. Their fight was not directed to conquering the Sikhs for subjugation. They aimed at the establishment of the Kingdom of God on earth. Hazrat Shaheed had imbibed these revolutionary thoughts and ideas from his illustrious grandfather and uncle. Hazrat Abdul Aziz, his uncle, had gone so far as to declare India as Dar-ul-Harb, though the last of the Mughal rulers was still sitting on the throne of Delhi. So my firm conviction is that Shah Shaheed and his party actually wanted to establish peace, justice, and the Kingdom of God on earth. It may be asked why their revolutionary ideas at first found a field of operations in the Punjab. The reason is that they knew that after conquering the Punjab they could

to inspire them with the great ideal and rally them under one banner. He knew that untrained minds and undisciplined intellects could win a victory if they were roused to action by a passionate appeal, but they would not be able to keep it and guard it for long. In view of this he went from place to place delivering lectures and sermons and instructing the people as to how to guard themselves from sin and violence. He called them towards God and His Prophet. He wanted to free them from the age-long shackles of schisms, irreligious observances and polytheistic customs and superstitions. His passion for moral reform was so great that he would go to harlots and prostitutes and preach to them the teachings of God and His Prophet. But it was not easy to uproot these filthy ideas which had been rooted there for years. So he was opposed, scandalised, libelled, and was made the target of fanatical oppression. But the true reformer bore all these sufferings with a smile on his lips. No oppression and disgrace could swing him even an inch from his lofty ideal. At last his preachings bore fruit and the Moslems were roused from slumber and ignorance. They realised their weaknesses and wanted to reform themselves. As a result of Hazrat Shaheed's preachings hundreds of widows married for the second time and thus obeyed the commandment of Allah. They gave up sin, violence and superstitions. Brothels and gambling houses were abolished. Their hearts were changed and now they adored the names of Allah and His Prophet.

### *Love of Hardships*

As he had to lead a great revolutionary movement, he was not content with his literary attainments. He wanted to be a true man of action and acquired high proficiency in all sorts of martial exercises. He was a fine rider, a clever marksman, a fearless lancer and a skilful wrestler. He was such a wonderful swimmer that he would sometimes swim down the Jamna to Agra and return to Delhi. The love for hardship and suffering in him was so great that in summer he would walk in the burning courtyard of the Jama Masjid of Delhi for hours together. He would neither eat nor sleep for nights together to acquire the power of forbearance.

### *Glorification of the Word of Allah*

All his soldiership and literary achievements were directed to one thing alone, that is, to re-establishing the glory of the Islamic banner. He wanted to extricate the Moslems from the sufferings and degeneration which had fallen upon them as a result of poverty, illiteracy and loss of political power. When he put his hand on the pulse of the nation he found that they were steeped in ignorance, misery and helplessness. The loss of political power had totally crushed their spirit. They had no life in them. But he knew it full well that in order to bring about unity of thought and unity of action in them it was at first essential to uplift their morals. True moral courage can work wonders. Then it would be easy

## *Birth & Education*

He was born in 1193 A.H. His father Shah Abdul Ghani was the son of Shah Waliullah Dehlavi. H. Shah Abdul Aziz was his uncle. His father was a great scholar of Islamic sciences and well-versed in theology and sufism. Shah Ismail received his elementary education from his father. But as he lost his father in his childhood, he came under the charge and guidance of his renowned uncle Sh. Abdul Aziz. The teacher, a great scholar, was immensely pleased at having him as his student, a student of great promise and bright future. He was intelligent and brilliant. The natural result was that he not only acquired excellence in Islamic and religious sciences, but also gained a footing in all other sciences of the age. His biographers are unanimous that apart from the religious sciences, he was adept in Philosophy and Mathematics. His love for geography was so great that he would pore over the map of India for hours and hours.

## *A great writer and a fine speaker*

God had gifted him with a facile pen and a forceful and persuasive tongue. He could win over the most hard-hearted and indifferent men. He had a fire of passion for the glorification of Islam burning within himself, that kindled the hearts of those who came to him.

Men who have brought about revolutions in the world have always been of two kinds. Either they were great soldiers, or they possessed a fiery and persuasive tongue by force of which they could change and revolutionise the hearts of men and nations. The Moslem Society of India is no exception to this general rule. But the Moslem revolutionaries and reformers have been characteristically possessed of the sterling qualities of both head and heart. If they had a forceful pen in the one hand, they held a mighty sword in the other. They were as great soldiers in the field of action as reformers in the domain of morality.

Among the Moslem revolutionaries of India H. S. Ismail Shaheed occupies the foremost place. He took up a movement which was purely Islamic in character and aimed at the glorification of Islam. The ways and means he adopted to gain the object were also Islamic to the core. His primary aim was not to set up Moslem rule in India, but to establish the "Kingdom of God", a Kingdom based on truth, justice, peace and godliness. Its chief object was to ennoble and uplift humanity and to raise them to a higher plane. How far he succeeded in his endeavours is not the point in question. We have to see if in the whole history of Islamic revolutions in India is there anybody else who has fought his way so gallantly and fiercely for the attainment of such a great ideal.

If the Muslim forces were to fight in Delhi, they could be easily besieged and could not get any help from anywhere. Bālākot was chosen to unite the North-Western Frontier, the Punjab and Sind, and to fight the Sikhs with reasonable prospects of success. Thus, on one hand Ismail Shahid wanted to create Pakistan and on the other to purge the country of the foreigners by putting up a strong and united opposition.

If Shah Ismail had not been betrayed by selfish people, the history of India as well as of Islam would have been totally different. It is a hard fact that Ismail's expedition did fail. But no one can deny that this great Martyr of Islam left a permanent mark on the history of the regeneration of Islam. His was the first attempt to regenerate Muslim society and to establish an Islamic Government purely on the lines of the orthodox Caliphate. He did away with pre-Islamic customs, abolished superstitious practices and eliminated social corruptions. His call was " back to Muhammad—may God keep him and bless him—and back to the Quran". To the Muslim community he gave the idea of Pan-Islamism and laid the foundations of Pakistan with his own life blood. Though Shah Ismail Shahid is dead, the ideals he died for are alive. He has wielded great influence on posterity. Jamal-ud-Dīn Afghani, Mufti Muhammad Abduhu of Egypt and several other political, social and religious reformers are but echoes of his genius.

Long live his ideals!

sideration the aims and objects of Shah Ismail Shahid, the choice appears to have been the best one. In accordance with his ancestors' views, the Shah had conceived the idea of creating Pakistan in India. For the accomplishment of this object there could be no better choice than a hilly place, with a strategic position, situated in the North-West Frontier.

He bravely fought against the Sikh rulers of the Punjab. His war was a purely religious one. He had no personal motives whatsoever. The only object was to regenerate the Muslim society by the establishment of Islamic caliphate. This movement for the first time aimed at Pan-Islamism. But unfortunately, due to the treachery and betrayal of some of his disloyal followers, the Shah was slain and his cause failed.

Some people are of opinion that the failure of the Shahīd was due to the wrong choice of the theatre of war. There are other people who object to his first attack on the Sikhs and not on the English. But these people ignore the facts. If the political history of India is critically studied and the different powers struggling for supremacy are surveyed, the true posture of affairs will be understood. The British were stronger than the Sikhs. They had a vast territory under their control. Being in possession of the seaports they could be easily reinforced from outside the country. Muslim forces were smaller in numbers and lacked both experience and military equipment. Sikh rule was confined to a limited area. The Sikhs had little hope of help from outside.

battlefield if the time were ripe. (*Tafhīmāt*, Vol. I, page 101). Similarly, Shah Abdul Aziz was a very staunch supporter of making preparations for war against the non-Muslim rulers.

Shah Ismail always kept the object in view. On one hand he continued regenerating the Muslim society by preaching the Quran and the *Sunnah*, and on the other he ceased not preparing plans and brooding over military operations. He took regular training for an armed conflict. When he realised that his efforts in the direction of beliefs were bearing fruit, he set out on a tour of the country for the organisation of the community, collection of funds and recruitment of soldiers. For conducting the war he appointed Sayyid Ahmad of Bareilly as the leader.

Here it may be pointed out that Shah Waliullah had not watched the political events in the country without any apprehension. He did feel the decay of the Mughals. He did not close his eyes to the political domination of the British traders. He was undoubtedly a staunch believer in the establishment of Islamic Empire purely on the lines of Abū Bakr and Umar's Caliphate. He was, as quoted above, ready for *jihād* against the non-Muslim rulers. But the ground was not prepared and the community was not ready.

Shah Ismail, emboldened by the success of Muhammad ibn Abdul Wahhāb in Najd, readily selected the theatre of war. Bālākot was chosen. Muslim soldiers from all over India began to assemble there. Taking into con-

an impious man, a doer of good and a doer of evil. But no social distinctions based on birth or wealth had any sanction.

Similarly, certain occupations and trades, like tanning, shoe-mending, etc., had come to be looked down upon as something unclean or base. Shah Ismail brought home to them the dignity of labour. Every lawful trade and occupation, he declared, that enables a man to maintain himself and his dependants, is respected and honoured in Islam. Thus Shah Ismail did his level best to purge the Muslim society of India of all the heresies and corruptions.

A still bigger and more tremendous task awaited the regenerator. The social reformer and religious preacher was to play the roll of a political thinker and soldier. He was to complete the work initiated by his grandfather Shah Waliullah and promoted by Shah Abdul Aziz. It was the work of regenerating the society by infusing military spirit into it and of restoring the Islamic Caliphate. The way was paved. Intellectual revolution had brought political awakening in its wake. Political awakening was now to give birth to the idea of a kingdom governed by the Quran and the *Sunnah*.

The leaders we have mentioned had been closely watching the decline and fall of the Mughal Empire. The events that had ushered the downfall were before their eyes. Shah Waliullah did endeavour but could not fully prepare the ground for a holy war. Nevertheless, he did express his readiness to take up arms and go to the

All people, including prophets and saints, are but creatures of God. He clarified the real conception of Islamic monotheism as well as the status of the Prophet in Islam. In brief, he preached the Quran and the *Sunnah* everywhere, in and outside the mosque.

Political downfall had brought intellectual slavery in its train. The already existing spirit of blind imitation became epidemic. Like numerous other corruptions under the influence of the Hindus, the Muslims had practically abolished widow re-marriage. In addition to disobedience of God's commands in the Quran, the departure from the *Sunnah* had given rise to countless evils and corruptions in society. Shah Ismail with all the force at his command took the matter in hand and once again revived this healthy practice.

Islam was and is a religion of equality, fraternity and justice. But intellectual slavery had introduced the caste system in Islam and created an ever-widening gulf, not only between man and man, but between God and man as well. The system of *Pīrs* and Sayyids had drawn a line of demarcation between a *Pīr* and a *Murīd*. Sayyids and *Pīrs* were just like Brahmins, and the other people no better than the Shudras or untouchables of the Hindu society. Shah Ismail declared that all the believers formed one brotherhood, and there was no place in Islam for any distinction of caste or race. All the Muslims were equal in the sight of Allah. In Islam nothing counted but personal merit based on personal efforts. The only difference was as between a pious man and

The condition of religion was worse. Despite the ceaseless efforts of Shah Waliullah and his four sons, there was little awakening in the community. Instead of worshipping one God the so-called Muslims worshipped many idols they had set up in different forms and various shapes. Hindu customs and manners had however the major share in shaping the Muslim society. The community not only believed in saints, but adored their relics, visited their tombs and prayed for their intercession. The task that awaited the reformer was stupendous.

Shah Ismail started his work by preaching the simple doctrines of the faith. He elucidated the Quranic conception of the Oneness of God. Allah, he said, is the only authority to resort to in all our affairs ; and it is He alone Who can grant our prayers. He is the Provider, the Sustainer and the Cherisher of the whole creation. It is Allah alone Who makes us fall ill and grants recovery. Riches and poverty lie with Him. He alone has the power to grant children, male or female. Prophets and saints are but His creatures. All are His servants. Shah Ismail emphatically condemned saint-worship, pilgrimage to holy shrines, vows, offerings and invocations to saints. He denounced the institution of *Pīrs* and sūfīs in the Muslim society in forceful terms, and made a strong protest against the heresies and innovations which were eating into the vitals of Islam. He boldly declared that Allah alone should be worshipped and bowed before. No authority, however great it may be, is worthy of worship.

So far the Holy Quran had been a sealed book for the common people. Shah Waliullah was the first Muslim in India to feel the urgent need of rendering the Book into a language understood and spoken by the people of the country. Accordingly, he translated the Quran into Persian. It was the first attempt to bring the masses into close contact with the teachings and the message of the Quran. Afterwards, Urdu versions appeared through the labours of his sons.

The principles which inspired Shah Waliullah did not perish with him. After his death the work of regeneration of the Muslim society on purely Quranic lines was taken up by his four sons, particularly by Shah Abdul Aziz.

Ground was thus being prepared for the establishment of God's Kingdom on earth. Shah Ismail (1193—1246 A.H.), the grandson of Shah Waliullah, was born and brought up with family traditions of vast erudition and great scholarship and with a burning passion for the revival of Islam in its pristine purity. He saw his environment and made an estimate of the work lying before him. The entire society was corrupt. Moral and intellectual stagnation combined with religious and political degradation had undermined the very foundation of the Muslim community in India. Ancient glory had departed, power had gone and empire had become ancient history. The whole country was being rapidly brought under sway by the foreigners.

Shah Waliullah has depicted the decaying Muslim society of his day and has very critically traced the foreign elements in the various phases of their life. In a scholarly manner he has dealt with the spirit that was working in sectarian views and in the blind following of sectarian leaders. He diagnosed the causes of the lethargy of the scholars and leaders of thought in later Islam. He boldly condemned and denounced the sectarian spirit that had split Islamic community in schismatic groups. He is greatly pained to see the community divided and neglecting the injunctions of the Quran and the teachings of the Holy Prophet. He was intrepid in his attack against the religious leaders who misled the community. He strongly protested against every evil and addressed the people of every walk of life, *Ulema*, mystics, scholastic theologians, philosophers, craftsmen, traders, soldiers and the nation as a whole; all fell alike under the lash of his denunciation. He expressed his conviction in the most forcible terms, without any fear of the consequences. He declared that pilgrimage to holy shrines at Ajmer and other places, vows, offerings, invocations to saints and the intercession of the dead persons were sheer idolatory. In his condemnation and denunciation of the evils and corruptions prevalent in the Muslim society Shah Waliullah never cared for any danger to his person. His writings on every subject—political, economic, social, cultural, historical, philosophical and religious—bear the stamp of originality.

absent from the minds of the people. In practical life there was little difference between the Muslims and the non-Muslims. The Muslims were Muslim in name only, whereas the whole structure of Muslim society was absolutely un-Islamic in spirit as well as in character. In social life, in customs and manners they resembled Hindus. Luxurious Court life had totally sapped the energy of the Princes. They were fit for nothing. Learning was a thing of the past. Scholarly criticism was an unknown science. Tyranny and oppression ruled everywhere. Strictly speaking, not only India but the whole Muslim world was plunged deep in darkness and ignorance. The Muslims were no better than the people of the dark ages of pre-Islamic Arabia where nothing but corruption and evil reigned.

In such a state of society was born Shah Waliullah (1114—1176 A. H.) of Delhi. The Muslim empire was being swept away by European traders. In every phase of life degradation and demoralisation were eating into the vitals of the Muslim society. One is really astonished to see the nature of the work done by this great reformer and scholar in that period of decay and corruption. A glance at his stupendous work and vast erudition fills one with astonishment and wonder. The great genius as he was, Shah Waliullah tackled every branch of learning and pronounced his views on every topic of the day. His writings mark him out as a first rate critic with a keen sense of observation and insight. He was extremely original in his criticisms. In his *Izālatul Khifā*

Abdul Mālik (705 -715 A. D.), but their influence was short lived. Later on, Muslim conquerors, who came to India from the North-West left permanent marks in the country. With very few exceptions, these rulers themselves were in little touch with Islamic teachings. In the course of time the Muslim masses lost sight of the original sources of the Faith—the Quran and the *Sunnah*—and thus Islam lost its pure form in India. Disbelief and polytheistic views continued to creep into the Muslim society, until corruption reached its climax in the time of the Mughal emperor Akbar, except for the untiring efforts of Shaikh Ahmad of Sirhind who upheld the cause of Islam by strongly protesting against and emphatically refuting and denouncing the anti-Islamic religious beliefs initiated by the Mughal Prince. Though the Mujāddid of Sirhind was made to suffer great hardships for preaching Islam in its puritanic form, his labours were crowned with success in the time of Jahangir and Shahjahan.

Lethargy of the leaders, selfish motives of the interested *Ulema* and cold indifference of the ruling princes towards Islam had given rise to corruptions in Muslim society. The masses were ignorant. Rulers and scholars lacked real sense of duty towards the Faith. People forgot the Quranic conception of the Oneness of God. Heresies became prevalent. Invocations, vows, offerings and pilgrimages to holy shrines and saint-worship became the order of the day. The Islamic conception of Allah, the Sustainer, the Cherisher and the Provider was totally

is bold, daring and straightforward. Above all, he is most uncompromising with everything un-Islamic.

In this connection one thing should not be ignored. It is not essential that every reformer should pass through all the stages and must reach his final goal – the domination and supremacy of Islam by the establishment of a theocratic government. He may work like Imam Ibn Taymiyya and Mujaddid Alf Thānī—the former died in jail but upheld the prestige of the Islamic doctrines as preached by the Prophet, and the latter defied the Mughal emperor Akbar who oppressed the Mujaddid simply because the pious man did not suffer the heretical views, polytheistic beliefs and un-Islamic customs that were propagated by the Mughal emperor —or he may pave the way like Shah Waliullah for the holy war to be conducted by Sayyid Ahmad of Bareilly and Shah Ismail Shahid, or he may succeed like Muhammad ibn Abdul Wahhāb of Najd who established an empire governed by the Quran and *Sunnah* of the Prophet and not by human law.

We come to a most important period in the history of Islam in India. It is an unfortunate fact that Islam as a political force came to India through the Khyber pass and not direct from Arabia, the craddle of Islam. No doubt, the Muslim explorers and invaders from Arabia came to India as early as the reign of Uthman (644—656 A.D.), even during the caliphate of Umar the Great (634—644 A. D.) and succeeded in conquering large portions of the country under the able leadership of Walīd ibn

and self-interested *Ulema* and displeasure of the illiterate masses were in store for any reformer who wanted to see Iṣlam purged of the heretical superstitions and polytheistic views prevalent in the Muslim society.

Self seeking *Ulema* had always been corrupting and misleading the Muslim masses as well as the Muslim rulers. As in the past, they still have a firm hold on the uneducated masses. It makes the already arduous task of a reformer doubly more so. The path before the reformers is very clear. They are not prophets, but do possess prophetic vision and sound judgment, daring and boldness, clear conscience and understanding, and the spirit of leadership. Whereas a prophet follows the divine word revealed to him direct, a religious reformer follows the Prophet. A reformer makes an estimate of his work. He first tries to understand his surroundings, then chalks out his programme accordingly. His primary duty is to revolutionise the views of the people. This intellectual revolution goes far to prepare the ground for the bigger events. He preaches and propagates his views and produces a good literature. He throws himself body and soul in his work. He not only eliminates evils, superstitious practices and innovations, but also makes endeavours to enforce the divine law and to establish the kingdom of God on earth, as desired in the Quran and the Sunnah, by creating a purely Islamic government. To this noble end his efforts are directed ceaselessly. He never shirks any sacrifice for the cause of *Tawhid*. He will readily lay down his life even. He

faced with courage even the wrath of kings. They did not shirk their duty or any sacrifices the task entailed. The wrath of mighty rulers could not daunt them, nor could the opposition of the mob-minded public stand in the way of their glorious march. This group of happy warriors always took great delight in undergoing hardships and privations in the noble cause of *Tawhid*. Among these veterans of Allah's Unity the most outstanding figures are Imam Abū Hanīfa (80—150 A.H.), Imam Mālik (95—179 A.H.), Imam Ahmad ibn Hanbal (164—241 A. D.), Imam Shāfi'i (150—204 A. H.), Imam Bukhārī (194—256 A.H.), Imam ibn Taymiyya of Harrān (1263—1328 A.D.), Imam ibn Hazm of Spain (994—1064 A. D.), Shaikh Ahmad of Sirhind (971—1034 A. H.), Shah Waliullah of Delhi (1114—1176 A. H.), Muhammad ibn Abdul Wahhab of Najd (1703—1792 A. D.), Sayyid Ahmad of Bareilly (1201—1246 A.H.) and Shah Ismā'īl Shahīd (1193—1246 A.H.) These and many other true sons of Islam made ceaseless efforts to revive the *Sunnah* of the Prophet, to enforce the Quranic monotheism and to eliminate foreign elements from the Islamic faith. The four *Imams* are noted for their courage and feared not to speak the truth even in the courts of mighty emperors. As to Ibn Taymiyya and Ibn Hazm, who can ignore their sacrifices? The story of the hardships and privations that fell to the lot of Mujaddid Alf Thānī, Shah Waliullah and Shah Ismail Shahid is no longer a secret. The task before these reformers was no less arduous. Wrath of the ruling princes, opposition from the selfish leaders

and superstitions. The result was sad. Monotheism as preached in the Book and practised by the Prophet could not remain without taint. Moreover, party feelings and sectarian views led to innovations and leader worship. This spirit gave rise to the visiting of holy shrines and saint-worship. In course of time, Muslim masses lost sight of the pure conception of the Unity of God as it was taught in the Quran and preached by the Prophet. Hence arose heresies and corruptions.

Quite a large number of the *Ulema*, in every age, denounced the superstitious practices of the masses, purging Islam of the heresies and innovations, condemning offerings, vows, invocations and pilgrimages to holy shrines. Superstitious practices and customs, purely un-Islamic in character and origin, were strongly combated by the doctors of divinity. Though every Muslim leader had been doing his best to enforce the *Sunnah* of the Holy Prophet and to eliminate everything having the least taint of polytheism, Umar ibn Abdul Aziz (61—101 A.H.) stands most prominent among such *Ulema* and *Amirs* who endeavoured to restore Islam as it had been preached by the Prophet. We cannot ignore the most valuable services rendered by the great Imams and famous traditionists to uphold the cause of the oneness of God. In every age and in every country there existed heroes of Islam who made the greatest sacrifices for boldly adhering to the *Sunnah* of the Prophet and for manfully declaring the real conception of monotheism in its pristine purity. These heroic soldiers of truth

IT is a matter of no small surprize that hordes of followers entered the fold of Islam in a very short time, and the rapidity with which it spread to the remotest corners of the known world, not only as a religion but also as a great political power, is still more wonderful. Islam has its own system of Government. To the world it gave new divine laws—social, economic, political, cultural and military. Islam's message was not a totally new one. It was a developed, perfected and final form of all the divine messages preached by Noah, Abraham, Moses and Jesus. The Prophet Muhammad—May God bless him—preached the same message—the message of peace through belief in the Unity of God. This doctrine is the fundamental principle of Islam. Belief in one God and negation of all others is the foundation stone of Islamic teachings. The Holy Quran lays the greatest stress on Oneness of God. On embracing Islam one has to declare: "No god but Allah, and Muhammad is His Prophet." All the battles fought by the Holy Prophet were in defence of the right to preach this doctrine. Later on the extension of the Muslim empire was to make the believers in the Unity of God strong enough to freely preach monotheism as taught in the Quran.

With the extension of the boundaries of the Islamic Empire a multitude of foreign elements were introduced in Islamic beliefs. People entered the fold of Islam, but did not quite forget their pre-Islamic customs

# A REGENERATOR OF MUSLIM SOCIETY

*by*

PROFESSOR ABDUL QAYYUM, M.A.
*Zamindar College, Gujrat (Pb.)*

in both respects. They could not find favour with any section of comfortable classes and the clergy. The descendants of these Peers and Mullahs still regard these Mujahidin and Martyrs to be Kafirs, because of the Fatwas issued against them by their ancestors. I can only say that this is due to their ignorance. May God show them light.

The second measure adopted by the British Imperialists was to change their policy towards the Muslims. Government services were opened to them and every possible encouragement was given to induce them to join English Educational Institutions. I need not discuss these efforts in this paper. The object was to counteract the Targhib-i-Muhammadiyya movement, for it was found, in the words of Bayley, that every Muslim youth coming out of the British Educational Institutions was lost to his religion. Here, too, the British diplomacy triumphed. But the great movement never died. Today it lives in the colony of the Mujahidin in the North-West Frontier, and who knows the future.

The British Imperialists realized that such a movement could not be crushed by mere force and joined their heads to find out ways and means to counteract it effectively. There were quislings in Muslim society then as they are today in Europe. The British Imperialists knew that the established Government could always rely on the vested interests. These were represented by the landed, monied and priestly classes. The British imperialists, therefore, turned towards them, and successfully. " A whole phalanx of Fatwas was procured," says Hunter, declaring the Wahhabis to be Kafirs and liberating the Muslims from the dangerous duty of rebelling. Well-to-do classes headed by K. B. Abdul Latif of Calcutta formed the Mohammadan Literary Society, Calcutta, and on 23rd November 1870 the law was discussed by the Ulema and verdict was given in favour of the British. Another Mullah named Abdul Haye secured a similar Fatwa from Mecca. The British diplomacy thus triumphed. The Muslim landholders and clergy were made to believe that their interests were safe only if the movement failed. The result was, as Hunter puts it, that " every Musalman priest with a dozen acres attached to his mosque or wayside shrine began to shriek against the Wahhabis and continued shrieking for 50 years." The Muslim land-holders also maintained the cause of the mosque, precisely as English land-holders defend the established Church, for any form of dissent, whether religious or political, is perilous to vested rights and Wahhabis are extreme dissenters

was not behind the other parts of India. Yahya Ali the chief priest, Zafar Ali of Thaneswar, Mohammad Shafi, a wholesale butcher of Delhi, Abdul Ghafur of Patna, A. Rahim, Ilahi Bakhsh, Hussaini, of Patna, Qazi Mian Jan, Abdul Karim, Hussain of Thaneswar and Ghafur stood this trial. They were betrayed by a Punjabi soldier of the Indian British Army who joined the party as a spy. The result of the trial was a foregone conclusion. To be a member of the movement was a capital offence. What type of men were these heroes of Islam ? Let their great enemy Hunter answer : "Time after time when the cause seemed ruined, they again and again raised the standard of holy war from the dust. Careless of themselves, blameless in their life, supremely devoted to the overthrow of the English Infidels, admirably skilful in organising a permanent system for supplying money and recruits, the Patna Caliph stood forth as the type and example of the Sect. Much of their teaching was faultless, and it has been given to them to stir up thousands of their countrymen to a purer life and a truer conception of the Almighty. Certain it is that the Wahhabi Missionary furnishes, so far as my experience goes, the most spiritual and least selfish type of the sect. Devoted to the one great work of purifying the creed of Mohammad, a Wahhabi knows no fear for himself and no pity for others. His path in life is clear, and neither warnings nor punishments can turn him to the right or left." These are the sons of Islam whom our so-called religious priests call *Kafir* and I shall presently show why ?

had nothing but admiration for him. Says Hunter: " His whole soul yearned with a great pain for the salvation of his countrymen and his heart turned singly to God."

Sayyed Ahmad was, however, fortunate in the selection of his Patna Caliphs Walait Ali and Inayat Ali. The other prominent leaders were Molvi Ahmad Ullah and Abdul Ghafur, the burser of propaganda at Patna. Sayyid Umar Shah was the leader of the frontier. He fell a victim to the dagger of a treacherous member of Utmanzai Tribe in 1858. His successors were Mohammad Ishaq, Mohammad Yaqub, and Molvi Abdullah. They were men of indomitable zeal and strength of will and once more raised the sacred banner from the dust. They covered the whole of India with their emissaries, and as Hunter remarks " brought about one of the greatest religious revivals that has ever taken place—a revival which kept alive the spirit of revolt against the British rule during the next 50 years." Karamat Ali of Jaunpur and Zainul Abidin of Hyderabad, two of the prominent missionaries, visited southern India also and raised such a hurricane of enthusiasm that even women cast their jewellery into the common cause.

The movement culminated, so far as India proper is concerned, in the so-called Mutiny of 1857, which in the words of Hans Kohn, was in fact the nationalist war to secure independence.

The movement, however, did not die with the Mutiny, but lived underground, as is revealed by the Ambala Trials of 1864, and these show that the Punjab

After having prepared the ground Sayyed Ahmad went away to the North-West Frontier in 1824 to operate from that base. Vicegerents were appointed in the main centres of India. Regular ecclesiastical taxes were levied on all and were paid with an eagerness and zeal unknown in history. The recruitment to the army of liberation was organized on a sound basis and there was never any shortage of men. Properly to appreciate the magnitude of the task of the leaders and its difficult nature, it is to be kept in view that the recruitment and all that it involved was done secretly, for the life of every member of the movement was forfeit to the crown.

The Jehad was actually started in Bengal by Titu Mian *alias* Nisar Ali *Shahid* of Chandpur. He met with great success, routed the British forces in a number of battles and in 1831 proclaimed the extinction of British rule and the re-establishment of the Muslim power. He was, however, fighting against great odds and gave his life for the cause on the battle-field.

The main centre was the North-West Frontier. Here the movement met with great success and Peshawar was occupied in 1830, a crushing defeat having been inflicted on the Sikhs. The leader was, however, greatly handicapped by the feuds of his allies, the Tribal Pathans. He did his best to bring about unity in them. The whole of his life was one continuous struggle to re-conquer India for the Muslims. He and Ismail Shahid both died in 1831—martyrs to the cause. Even his enemies

stirred to its depth. A number of popular songs were also composed to intensify the spirit of national consciousness and to impress upon the hearers that it was the first duty of a regenerate to lay down his life for his cause. The following lines from one of the songs indicate the nature of the appeal :—

" War against the infidel is incumbent on all Musalmans ; make provision for it before all things.
He who from his heart gives one farthing to the cause shall receive hereafter seven hundredfold ;
He who both gives and joins in the fight, shall receive seven thousand-fold from God ;
He who shall equip a warrior in this cause of God shall obtain a martyr's reward ;
Cease to be cowards ; join the divine leader, and smite the infidel.
Thousands go to war and come back unhurt ; thousands remain at home and die ;
You are filled with worldly cares and have forgotten your Maker in thinking of your wives and children ;
How long will you be able to live with your wives and children ? How long to escape death ?
Fill the uttermost ends of India with Islam, so that no sounds may be heard but 'Allah Allah' ".

The effect of the movement was great. It roused the Muslims from the stupor in which they had sunk . . . To quote the official report, "Every village, indeed almost every family, followed the example of their leaders and contributed to the cause of the holy war."

" Fatwas " that India was no longer "Dar-us-Salmar" but was " Dar-ul-Harb ", and that it was the duty of every Muslim to expel the intruders. The Fatwa of Shah Abdul Aziz was delivered in the following words : " When Infidels get hold of a Mohammadan country and it becomes impossible for the Musalmans of the country, and of the people of the neighbouring districts, to drive them away, or to retain reasonable hope of ever doing so ; and the power of the Infidels increase to such an extent, that they can abolish or retain the ordinances of Islam according to their pleasure ; and no one is strong enough to seize on the revenues of the country without the permission of the Infidels ; and the (Musalman) inhabitants do no longer live so secure as before ; such a country is politically a country of the Enemy—Dar-ul-Harb." The Empire of the Christians extends from Calcutta to Delhi. This is the country of the Enemy, for idolatry (Kufr and Shirk) is everywhere current, and no recourse is made to our Holy Law. Whenever such circumstances exist in a country, the country is " Dar-ul-Harb."

Every Musalman was called upon to declare his faith ; to state, in the face of his co-religionists, whether he would or would not contribute to the Mujahidin's Camp on the Frontier and to elect, once and for all, whether he would play the part of a devoted follower of Islam, or be a subject of Queen Victoria.

A mass of literature was produced and in the words of Hans Kohn everywhere the Muslim population was

living force.

In Mecca he attracted the notice of the authorities who were opposed to Wahhabi movement. He was publicly insulted and expelled. The result was that he was no longer a religious visionary and a reformer of superstitious abuses. He became a devoted follower of the Arab leader. Coming back to India he gave up mere preaching. He felt that something bold was to be undertaken to regain Muslim glory. His efforts from now on tended in two directions: to reform Islam from within and to restore the Muslim political power by expulsion of the English and the repudiation of European influence.

In the words of Hunter, " Whatever was dreaming in his nature now gave place to a fiery ecstasy, in which he beheld himself planting the crescent throughout every district in India. Whatever was indistinct in his teaching, henceforth assumed the precision of that fierce, formulated theology, by which Abdul Wahhab had founded a great kingdom in Arabia, and which Sayyed Ahmad hoped would enable him to rear a still greater and more lasting Empire in India." With this object in view he made the grim determination to expel the Sikhs from the Punjab and the British from the rest of India at whatever expense of the blood of the infidels and at whatever sacrifices of Muslim life. He started with the intensification and vitalisation of religious life and roused the Muslims to self-consciousness and national and political rebirth.

Shah Abdul Aziz and Shah Abdul Haye gave

of Shah Abdul Aziz, both scholars of great merit, publicly accepted Sayyed Ahmad as their spiritual guide and as a man sent by God to accomplish the task of Muslim regeneration and liberation. This attracted popular attention to the future leader. An extensive tour was arranged in 1820. The apostle journeyed slowly from Delhi to Calcutta. A protracted halt was made at Patna, where the movement was organized on the lines of a regular Government. Four Caliphs and a high priest were nominated by formal deeds in different parts of the country and an agent was appointed in every district with regular officials to go forth and collect taxes. Patna was made the headquarters of the movement. By the end of the year the movement was on a sound footing with an organisation as complete and thorough as that of an established government. The movement so far was purely religious and contemplated moral reformation.

The teachings of the new apostle were simple. He abstained from all doctrinal discussions and devoted himself exclusively to practical problems of everyday life, exhorting his hearers to live better lives, to believe in the Unity of God and the Equality of man, and to discard the superstitious accretions which they had borrowed from the Hindus. It was an attempt to restore Islam to its pristine simplicity.

In 1822 Sayyed Ahmad went to Mecca and came in contact with Wahhabism, a similar movement of reformation started in Arabia by Abdul Wahhab of Najd, in the middle of the 18th century, to revive Islam as a

footsteps. Shah Waliullah wrote *Izalat-ul-Khifa* and two of his sons translated the Quran into Urdu. Sayyed Abdulla, one of their devoted disciples, published the translation of Shah Abdul Qadir in Hugli in 1829, and thus for the first time the Muslim masses in India were able to understand the text of their Holy Book. Great was the change it wrought. Islam began to awaken from the lethargy in which it was sunk. The movement, called "Targhib-i-Muhammadiyya" generally known as Wahhabi movement, became a vitalising force by the beginning of the 19th century under the leadership of Shah Abdul Aziz.

Gifted with uncommon insight he detected that the Muslim rule was imperceptibly disappearing. He was agitated about the relation which the Muslims were to have with their non-Muslim rulers. He arrived at the conclusion that the change of the status of the Musalmans had automatically brought into play a new set of obligations on their part, and the first of these obligations was the expulsion of the foreigners, for the Holy Quran is based upon the conception of the Muslims as a conquering and not a conquered people.

Having arrived at this decision the course of his action was clear. Finding that the success of his cause required an enthusiastic and fiery spirit at its head to galvanise people into activity, he converted Sayyed Ahmad Brelvi (born 1786) a Pindara Chief and sent him forth as a preacher after a three years' noviciate. Shah Ismail, the son-in-law and Shah Abdul Haye the nephew

name of the Muslim Emperor of Delhi. They were afraid of assuming the insignia of sovereignty and pretended to be the deputies of a Muslim monarch. The truth is, that had we hastened by a single decade our formal assumption of the sovereignty, we should have been landed in a Muslim rising infinitely more serious than the Mutiny in 1857. The whole status of the Muslims would have been suddenly changed. We should have been in the position of an Infidel power who had seized and occupied a Country of Islam. The great majority of the Indian Muslims would have deemed it their absolute duty to rebel; for the first obligation 'of every man, woman and child,' in such a case, 'is to hurt and drive away the Infidel Ruler'."

The admirable moderation of the East India Company's servants, and their determination to let Muslim power expire by slow natural decay, without hastening its death a single moment, averted this danger.

There were some, however, who were acute enough to detect the change. Most important of these was the family of the famous "Muhaddis" Shah Wali Ullah of Delhi. A profound scholar of liberal views, he was deeply impressed with the refrigeration of religious emotions and the decay of the Muslim power and started the great movement of Muslim regeneration and reformation with his famous book *Hujjat-ullah al-Baligha* (1735), and his translation of the Quran in Persian (1737). His sons, Shah Abdul Aziz (d. 1824), Shah Rafi-ud-Din (1749-1818) and Shah Abdul Qadir (1753-1815) followed in his

thundercloud of the Rohilla invasion and amid the blinding lightning glare of Ghulam Qadir's ferocity. The Emperor was blinded and dethroned and the royal ladies subjected to the grossest insults. The rescue came from the Scindhia who assumed a protectorate over Delhi and thus reduced the Mughal enclave to the level of a puppet sovereignty.

At this time the British diplomacy under Lord Wellesley sought to utilise the Mughal name in the war with the Mahrattas. The Emperor, who was far from happy under the Scindhia, welcomed Lord Lake's army when it entered the capital in 1803, and with it ended the Empire of Akbar. The farce was, however, kept up, for though rulers *de facto*, the English did not deem it politic to assume the status of rulers *de jure*. It was feared that any haste in the assumption of the insignia of sovereignty would result in the rising of the Muslims, it being their duty to shake off the infidel rule. India was, therefore, allowed to pass from a Country of Islam into a Country of the Enemy by absolutely imperceptible gradations.

Sir William Hunter refers to this policy in the following words: "The early servants of the East India Company perfectly understood their position, and when they first took over the provinces, they left the Mohammadan Administration absolutely undisturbed. They retained the Muslim code as the law of the land, appointed Muslim Law Officers to carry it out, and in the smallest matter, as in the greatest, acted merely in the

transgresses the law ; even as in the case of a weapon of iron, if the weapon is made for driving away thieves or for arresting them, then the making of it is a pious act; but if it is made to help or defend the thieves, then the making of it is sinful."

I have already mentioned a little earlier that the Muslims had suddenly awakened to a sense of their political situation in the beginning of the 19th century and offered serious resistance to the new culture, appreciating its full implications. This awakening was due to the religious reformation and national consciousness brought about by *Shams-ul-Hind* Shah Abdul Aziz and his followers Sayed Ahmad Brelvi and Shah Ismail Shahid and others whose memory we are celebrating today.

The Mughal Empire had been decaying in India ever since the death of Aurangzeb (1707), but so effective had been his control that it was not perceptible during the reign of his successor. It was, however, shaken to its very foundations when Nadir Shah sacked Delhi in 1739. The distant provinces like Hyderabad and Oudh declared their independence. The Mahrattas were already independent in the south. The Sikhs became more turbulent in the Punjab and Ranjit Singh carved out a kingdom for himself by taking advantage of the generosity of Shah Zaman. During the years 1772-1785, the period of the premiership of Mirza Najaf Khan, the sun of fortune emerged from the storm clouds of the mid century and cast a pale evening glimmer upon the Mughal throne. Then it finally went down behind the

foreign tongues to him. He was equally indifferent to both, except as a means of preferment. With the Muslims the case was altogether different. Before the country passed to us, they were not only the political but the intellectual power in India. They possessed a system of education which was capable of affording a high degree of intellectual training and polish. During the first seventy-five years of our Rule we continued to make use of this system as a means for producing officers to carry out our administration. But meanwhile we had introduced a scheme of Public Instruction of our own; and as soon as it trained up a generation of men, all Hindus, on the new plan, we flung aside the old Muslim system, and the youth found every avenue of public life closed in their faces. Musalmans did not accept this change. An ancient conquering race cannot easily divest itself of the traditions of its nobler past."

It is therefore incorrect to say that Muslims did not acquire new culture and learn English because they believed that it was *Kufr* to learn English. They resisted the new culture because of much weightier considerations, political, national and religious, and in support of this I refer to the *Fatwa* of *Shams-ul-Hind* Shah Abdul Aziz, the intellectual head of the movement, which led the opposition to the new culture. The *Fatwa* reads: "Learning English for the purposes of reading books, writing letters, and knowing the secret meanings of words, is permitted. But if any man learns English in order to unite himself with the English, he sins and

wonder that the Musalmans have held aloof from a system which........was in its nature unavoidably antagonistic to their interests and at variance with all their social traditions ? The educated Muslim sees himself practically excluded from the share of power and of the emoluments of Government and sees these and all other advantages of life passed into the hands of the Hindus.

" The Government has failed in its duty to Muslims. They are decaying under British rule. Any answer based on their own degeneracy is a *petitio principii*, for their degeneracy is one of the results of our political ignorance and neglect. To this day they exhibit at intervals their old intense feeling of nationality and capability of war-like enterprize ; but in all other respects they are a race ruined under British rule. Is it that Hindus have all along been better men than Muslims and only required a fair field in order to outstrip in the race ? No. The Hindus under Muslim rule accepted their fate exactly as they have done under our own. At present preferment depends upon a knowledge of English and they learn English. Formerly preferment depended upon a knowledge of Persian and they learnt Persian. It was not till a knowledge of Persian became profitable to them under the orders of Todar Mal that it became general among them. When, therefore, we introduced English into the public offices, the facile Hindu immediately mastered the language necessary to his success in life. The former language of public business under the Muslims and the new one under ourselves, were alike

Muslim to the new culture was, therefore, based not on their bigotry and narrow-mindedness, but was partly the outcome of the policy of the Government and partly due to the religious reformation and national awakening brought about by *Shams-ul-Hind* Shah Abdul Aziz and others.

It is generally given out that the Muslims being conservative were averse to progress and advancement, whereas Hindus, who were helpless during the Muslim regime, found their opportunity and availed themselves of it to the fullest extent. So much currency has been given to this wild allegation that even the Muslims believe it to be true. The allegation is absolutely baseless and insults our ancestors. The truth is that this myth is the concoction of the British Imperialists, who as a result of the change of their policy towards the Muslims and Hindus wanted to justify their conduct towards the Muslims to convince them of their *bona-fides*. These Imperialists realised that because of their policy of the suppression of the Muslims and the encouragement of the Hindus, the latter had acquired, quite contrary to their expectations, a political consciousness which was likely to be dangerous to British interests. The whole political situation was examined, particularly the "Targhib-i-Muhammadiyya" Movement, and here is the finding of E. C. Bayley, C.S.I., Secretary to Government of India, Home Department, in the sixtees. After discussing at length the policy of the Government towards the Muslims and the Hindus, he says "Is it a subject of

through gradual assimilation. The type of response, therefore, was the combination of " centralised control" and " diffused penetration and permeation."

The foreign domination also affected the cultural response and conflict of the Hindus and the Muslims in another way. Imperialistic considerations for the perpetuation of political dominance necessitated that the Muslims should be made to go down and the Hindus be encouraged to rise up. To effectively secure the object the Muslims were debarred from all offices till in the words of Bayley they could not hope for " any post above the rank of porter, or filler of inkpots and mender of pens." There was thus no economic motive with them to acquire the new education.

Further, the Muslim educational institutions were denuded of funds which were misappropriated on the largest scale for the education of the Hindus. I refer to two such funds. The Mohsin Fund of Calcutta and the Itimaduddaula Fund of the Punjab.

The policy of the Government did not stop here. The Muslims were excluded from the Oriental journals and libraries. The Court of Directors ordered that no money should be spent on research in Semitic culture and Dr. Roer, in charge of the Asiatic Society from 1847—52, and after him Wilson, Goldstucker, Aufrecht, Hall and others rigorously enforced it, so that Arabic was completely ignored. Their activities were devoted to Sanskrit, and the Muslims were led to believe that their culture was in danger of extinction. The resistance of the

persuasion and education under the guidance of national leaders. The process is no doubt slow, piecemeal, sometimes wasteful and often lacking in co-ordination, but it always has the advantage of being voluntary and evolutionary and has no fear of such disasters as were witnessed in Afghanistan during the regime of Amanullah Khan.

The problem of India, however, is unique. The first to come in contact with the West, it is not only politically subordinate to the invading culture, but represents within itself varied cultural patterns, of which the Hindu and the Islamic are the major. The Muslims, who had been on the downward path, both politically and morally, during the 18th century, suddenly awakened to their serious situation in the beginning of the 19th century, simultaneously with the penetration of the new culture, and offered serious resistance to it. For the Hindus, who had been politically subordinate for about a thousand years and whose values, at the time, were governed by economic considerations, it was a matter of choice between two foreign cultures, and they, therefore, willingly yielded to the new. But even in their case the problem of cultural readjustment was by no means so simple. Wedded to the time-old traditions which had acquired religious sanctity, they were not willing to accept any modification in their institutions, and thus the Government had to legislate to put an end to those more hideous and revolting as Sati, infanticide and human sacrifice. In other cases; reform was effected

When two alien civilisations, opposed to each other in their ideals, are forced to come in intimate contact, the problem of cultural conflict and readjustment is inevitable. Its nature, however, differs according as the invaded civilisation happens to be free from foreign political domination and is able to control the processes of cultural evolution or not. Here, too, the existence or the absence of a strong ruling body or effective leadership is a factor which is always of vital importance. In the case of national consciousness resistance to the foreign culture is, no doubt, natural ; but when the invaded culture has not the stamina to face and stem the onslaught of the invading culture, or the national spirit is somnolent and in putrescent stages of consciousness, or again it feels that it is essentially inferior and out-of-date and is inadequate to meet new and more complex situations, it either passively submits to the new civilisation or consciously but independently replaces its own social and political institutions by new forms and new ways to avoid the greater danger of political subjugation.

Cultural response under these circumstances always represents one of the two main types, that of "centralised control" as in the case of Japan and Turkey, where a nationwide adaptation to the new civilisation was rapidly imposed by a strong ruling class, or that of "diffused assimilation and permeation" as in China. Here the cultural adjustment takes the form either of unconscious adaptation through what may be called "long exposure" or of conscious reform effected through

A NEW ERA—an era of cultural reorganization—dawned in India with the advent of the 19th Century. It was the outcome of the penetration of the West, which actually dates back to the middle of the 15th century but became effectively operative after a lapse of 200 years, when British diplomacy succeeded in the elimination of its other European rivals.

The impact of two civilisations quite alien to each other and determined by diametrically opposite ideals and concepts of values, necessitated the new orientation and the readjustment of the customs and ways of life in their intimate as well as public aspects.

The subject of this paper is how India—particularly Muslim India—reacted to this new invading culture. The problem is a complex one and not easy to answer. India is a vast continent, inhabited by different races, representing widely different cultural patterns. The degree of response, therefore, could not be uniform. Again, the different parts of the country did not come in contact with this culture at the same time, and in some provinces, as in the Punjab, the modern influences began to work only in the latter half of the century. The assimilation of the new culture was, therefore, confined in the beginning to border regions and a few pioneer individuals. It, however, spread rapidly inwards and downwards, so that it soon permeated wider and wider sections in every province.

# The Reaction of Muslim India to Western Culture in the 19th Century with particular reference to the Wahhabi Movement

*by*

DR. TASADDUQ HUSSAIN KHALID
*M.A., Ph.D. (London), Bar.-at-Law*

39. Ismā'īl, Muḥammad, *Ḥaqīqat e Imāmat*, MSS owned by M. Nūrul Ḥaq of the University Oriental College, Lahore.
40. Muḥammad 'Alī, *Makhzan e Aḥmadī*. Panjab University Library Manuscript No. Pf. II 19.

## (4) URDU

27. Abul Ḥasan 'Alī, Sayyid, *Sīrat e Sayyid Aḥmad Shahīd.* Lucknow, 1939.
28. Aḥmad, Sir Sayyid, *Āṣāruṣ Ṣanādīd.* Lucknow, 1876.
29. Bashīruddīn Aḥmad, *Wāqi'āt e Dārul Ḥukūmat e Dehlī*, Delhi, 1919.
30. Ismā'īl Muḥammad, *Taqvīatul Īmān.* Cawnpore, 1343 A.H.
31. Ja'far, Muḥammad, *Tawārīkh e 'Ajība.* Sādhaura.
32. Kanhayyā Lāl, *Tārīkh e Punjāb.* Lahore, 1881.
33. Manẓūr, Muḥammad, *Alfurqān* (Shāh Walīullah Number.) Bareilly, 1359 A.H.
34. Sulṭān, Muḥammad, *Taẕkīrul Ikhwān.* Cawnpore, 1343 A.H.
35. Ṭāhir, Muḥammad, *Ḥayāt e Ṭayyiba.*

### B—Manuscripts

36. Būṭe Shāh, G. M. Dīn, *Tārīkh e Panjāb.* Panjab University Library Manuscript No. A Pe. III 8.
37. Ismā'īl, Muḥammad, *Īẓāḥul Ḥaqqiṣ Ṣarīḥ fī Aḥkāmil Mayyiti Wazzarīḥ.* MSS owned by M. Nūrul Ḥaq of the University Oriental College, Lahore.
38. Ismā'īl, Muḥammad, *Risāla e Yak Rūza*, MSS owned by M. Nūrul Ḥaq of the University Oriental College, Lahore.

13. Khazan Singh, *History and Philosophy of the Sikh Religion*. Lahore, 1914.
14. Latif, Sayyid Muhammad, *History of the Panjab*. Calcutta, 1891.
15. M'gregor, W. L., *The History of the Sikhs*. London, 1846.
16. Mohan Lal, *Life of the Amir Dost Muhammad Khan of Kabul*. London, 1846.
17. Pearse, Hugh, *Memoirs of Alexander Gardner*. London, 1898.
18. Prinsep, H. T., *Origin of the Sikh Power in the Punjab*. Calcutta, 1834.
19. Prinsep, James, *The Journal of the Asiatic Society of Bengal*, Vol. I, 1832. Calcutta, 1832.
20. Sinha, N. K., *Ranjit Singh*. Calcutta, 1933.
21. Stulpnagel, C. R., *The Sikhs*. Lahore, 1870.

(2) PERSIAN

22. Ismā'īl, Muḥammad, *Aṣ Ṣirāṭul Mustaqīm*. Delhi, 1322 A.H.
23. Kanhayyā Lāl, *Ẓafar Nāma e Ranjīt Singh*. Lahore, 1876.
24. Sohan Lāl, *'Umdatut Tawārīkh*. Lahore, 1885.

(3) ARABIC

25. Ismā'īl, Muḥammad, *Uṣūlul Fiqh*. Delhi, 1895.
26. Ismā'īl, Muḥammad, *Letter to Mullā Baghdādī*. Cawnpore, 1343 A.H.

## AUTHORITIES

### A—Printed Books

### (1) ENGLISH

1. Beale, T. W., *An Oriental Biographical Dictionary*. London, 1894.
2. Blumhardt, (An article in) *Encyclopædia of Islam*. London, 1913.
3. Court, Major Henry, *History of the Sikhs*. Lahore, 1888.
4. Cunningham, J. D., *A History of the Sikhs*. London, 1918.
5. *Gazetteer of the Hazara District*. Lahore, 1883-84.
6. Gordon, Sir John J. H., *The Sikhs*. London, MCMIV.
7. Gough, Sir Charles and Innes, A. D., *The Sikhs and the Sikh Wars*. London, 1897.
8. Grey, C., *European Adventurers of Northern India, 1785 to 1849*. Lahore, 1929.
9. Hidayat Hosain, M., (An article in) *Encyclopædia of Islam*. London, 1913.
10. Hughes, Rev. T. P., *Notes on Muhammadanism*. London, 1875.
11. Hunter, W. W., *The Indian Musalmans*. London, 1871.
12. *The Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland*, Vol. XIII. London, 1852.

their action, they could not succeed, and they did not. I think the lines and careers of these reformers should be good eye-openers for all those who now or in future wish to work such a revolution.

The second historical fact which was the cause of the defeat of the reformers was that they had formed a wrong estimate of the field of action to which they shifted their scene of activities from the centre of India. Although there is no evidence to prove the fact, yet it is obvious that being hard pressed by the local authorities at Delhi to discontinue their activities, they thought it prudent to shift the scene of their activities to the North-West Frontier thinking that the Muslims of that place would help. Here again they had not gauged the situation properly. The Muslims of the North-West Frontier were not ready enough to accept the change of life which the reformers preached. They swallowed the remedy but with a distaste for the whole thing. They were not properly and adequately educated to comprehend the Islamic conception of life. They joined hands with them, but got rid of them as soon as they could get rid of them. Gardner has given us a true picture of the North-West Frontier *mujahids*, who came to help the reformers in *jihād*.[1] As soon as the reformers fallen in the battle, their North-West Frontier helpers fell on the Indian fighters and jumping at their throats stripped them naked of their last garment. This says a lot about the mental attitude of the North-West Frontier *mujahids*. To work a revolution on Islamic lines, the reformers ought to have waited long enough to prepare the ground for such a revolution. Until the Islamic outlook embraced the whole field of

---

[1] See *ante*.

two reformers successful in their efforts. As is obvious, they staked everything in their lives to pursue their objectives and sacrificed all their possessions in this pursuit, and yet all this ended in failure. It was not only that. The personal character of these reformers was so extremely in conformity with the Islamic mode of life that we simply wonder to find that such noble persons were defeated in the face of evil forces. This naturally requires an explanation, and if in a sentimental way we close our eyes to the dire consequences which followed the movement of these reformers, we shall be guilty of serious neglect.

To all appearances the first and most vital factor which was the cause of the failure of this movement, which was started for the regeneration of Muslims of India, was that the movement did not totally dissociate itself from the evil influences of mysticism, which is mainly responsible for the inaction of Muslims all over the world. Although Maulavī Muḥammad Ismā'īl preached all his life against the *pīrs* and *murshids*, yet he himself professed to die a disciple of Sayyid Aḥmad. He knew the limits of this relation and managed to keep himself within these limits, but the Muslim masses neither knew the limits nor conformed to the practical code of life of Maulavī Muḥammad Ismā'īl. Although the reformers had purged the old system of mysticism of all its vices, yet the skeleton was so much infected with the age-long diseases that it very soon developed them again to their old perniciousness.

in the supposition that their favour can in any manner, reverse the order of fate—the dedicating in vows and setting apart animals to be sacrificed as offerings to them or in honour of them, which he declares to be impiety—the making offerings of gratitude or propitiation to saints after the birth of children and the giving to children names implying that they have been obtained through their favour: such as Nabī Bakhsh, Imām Bakhsh, Madār Bakhsh, 'Abdun Nabī, *Banda e 'Alī,* etc.

Secondly, the miserable condition of the Muslims of India occupied most of his thoughts. The lethargy and disgrace into which Muslims had sunk made his blood boil, and to liberate them from their serfdom to the Sikh rulers he started preaching to them of *jihād* and actually led them to one. His was an ambitious scheme. If he had succeeded, to-day the Muslims would not have felt the necessity of running after the new fangled ideas of modern civilization for their liberation. He insisted on the restoration of that order of life for Muslims, in which their life would be governed only by Islamic laws. He exhorted his followers to 'follow no one, be he *mujtahid*, *imām*, *ghauṣ*, *quṭb*, *maulavī*, *shaikh*, *king*, *minister*, *pādrī*, or *pandit*, against the authority of the Quran and the traditions.' But it is sad to reflect that he did not succeed in his second objective.

### *Conclusion*

Leaving sentiment aside, the question naturally arises what were the causes which did not make these

things figure very prominently in his life and are very conspicuous in all his admirable undertakings, which were based upon no interested motives. Firstly, he had a painful feeling that innovations among the Muslims of India had sprung from association with sceptics or heretics, and with those who sin against the Unity of God. This was mainly responsible for the crumbling of the very foundations of Islamic life in India; and the whole edifice of the national life of Muslims, although it looked very magnificent, was soon going to fall down. Among the abuses to which he found the Muslims addicted he mentions the following in his works: excess of respect to *murshids* or religious instructors, the numerous innovating ceremonies, which are generally observed at tombs, and making offerings in honour of saints. He said that Muslim *murshids* had become very much like Hindu *gurus*. In India, more than in any other Muslim country Islam and کفر had been mixed like کھچڑی. If the Hindus have their Gaya, their Mathura, and their Kashi, the Muslims have their Makwanpur, their Bharaich and their Ajmer. The one set builds *maṭhs* over their idols; the other, not to be behind hand, raise domes over their saints' tombs. In the *maṭhs* you will find *mahants* and *Gosāins*: at Muslim shrines, *khādims*, *mujāvirs* and *pīrzādas*. He denounced all these practices. Among the most popular practices springing from reverence for saints, which he denounced vehemently, are prayers addressed to them for any particular desire or blessing, as for children, etc.,

He wrote one *qaṣīda* in Persian in praise of his guide Sayyid Aḥmad, out of which I record a few verses here :

بیا و تهنیت شجره امامت کن
که بعد گم‌شدنش هاں چگونه گشت پدید
هزار شکر به یزدان پاك کز فضلش
ز نور قدسی فیضش که قطرهٔ به چکید
ز فیض او به قلوب جمیع اهل یقین
ز دین ماحض حنیفی بنے عجب روئید

بداهتهٔ همه احبار این زماں دانند
که زان اوست ازیں عرصه مذصب تجدید
همه کمال تو مورث ز احمد مرسل
که عرق پاك تو اوصاف پاك ازو بکشید

دریں زمان توی جای نشیں پیغمبر
خلیفه و خلف و وارث و وصی رشید[1]

He also composed a *maṣnavī*, *Silk e Nūr* or 'Thread of Light' in Urdu. It begins thus :

الهی تیرا نام کیا خوب هے که هر جان کو وهی مطلوب هے
اسی سے هے هر دل کو آرام و چین وهی سب زبانوں کا هے زیب و زین[1]

*His Teachings*

I will now pass on to tell you something about his teachings. His own life was a perfect illustration of the way he wanted other people to lead their lives. Two

[1] Muḥammad Ja'far, *Tawārīkh e 'Ajība*, p. 149.

with a surprising degree of religious capacity and illumination. Its professed purpose is kindly to impart to the world the benefits of the experience and inspired discoveries of a saint so eminent as Sayyid Aḥmad.

### 7. *Uṣūl ul Fiqh*

It is a short treatise of 36 printed pages in Arabic. The treatise is written essentially with the object of determining the principles of Islamic Jurisprudence. Maulavī Muḥammad Ismā'īl has successfully described in a concise way the different sources of Islamic Law with their respective importance, *viz.*, the Holy Qurān, the *sunnat*, the *ijmā'* and the *qiyās*.

### 8. *Minor Works*

Besides these important works, Maulavī Muḥammad Ismā'il is supposed to have written several letters, two of which are preserved. One is written in Arabic and addressed to Mullā Baghdādī. A reference has already been made to this letter. Another letter is in Persian, which is addressed to Nawab Wazīruddaula of Tonk, who was also a disciple of Sayyid Aḥmad. This letter was written during the *jihād*, exhorting the Chief of Tonk to help the *mujāhids* in every possible way he could, as the *mujāhids* were busy in a *jihād* against the Sikhs.

Maulavī Muḥammad Ismā'il also tried his hand at poetry, and his poems are in no way a mean achievement.

no compromise can be made between Islamic *imāmat* and kingship.

' پس سیاست ایمانی و سیاست سلطانی را بمنزله آب شیرین و آب شور تصور توان کرد - پس هرقدر که آب شور را به آب شیرین آمیخته کنند همان قدر لذت آب شیرین پنهان خواهد گردید و حدت آب شور نمایان '۔[1]

(The kingly administration can be considered as brackish water when compared with the Divine administration, which is sweet water. To the extent that you mix brackish water with the sweet water, as much the sweet water will lose its taste and the sour taste of brackish water will become effective).

## 5. *Īẓāḥul Ḥaqqiṣ Ṣarīḥ*

This is a treatise in Persian on the burial of the dead. It comprises an introduction, two chapters and a conclusion. In the introduction the author has described all the un-Islamic innovations which have become part of the ritual amongst the Indian Muslims, and in the main portion of the book he has described the proper methods of burying the dead.

## 6. *Ṣirāṭul Mustaqīm*

The *Ṣirāṭul Mustaqīm* or 'The Straight Path,' is the most important of several treatises composed by Maulavī Muḥammad Ismā'īl in Persian. It gives the fullest account generally known of the tenets of Sayyid Aḥmad. The main object of the author in composing it was to justify the claims of Sayyid Aḥmad, as a devotee, gifted

[1] Muḥammad Ismā'īl, *Ḥaqīqat e Imāmat*, f. 91.

prayers' is an unobligatory *sunnat*, which may be resorted to by Muslims. But those who do not follow this practice, should not be rebuked or coerced into it, although they may not act upon it even once in their life. The author was greatly complimented by his learned uncle Shāh 'Abdul Qādir on the production of this work.

### 4. *Ḥaqīqat e Imāmat o Zikr e Aqsām e ū*

This work is divided into two portions and is written in Persian, describing in details the Islamic view of the office of the patriarch, the *Imām* or the head of a Muslim State. The first portion deals at great length with the Muslim conception of *imāmat*. Five qualities of a man are considered as fundamental essentials which make him fit for the guidance of the destiny of his *millat*.

They are :

(*i*) وجاهت or 'dignity.'
(*ii*) ولايت or 'sainthood.'
(*iii*) بعثت or 'missionary's qualities.'
(*iv*) هدايت or 'divine guidance.'
(*v*) سياست or 'administration.'

These qualities have been further explained from a purely Islamic standpoint.

The second portion contains an account of the kinds of *imāmat*. The rightful *imāmat* is described to be a close copy of the conduct of the Holy Prophet. Kingship is considered to be an un-Islamic form of government of an Islamic state. The author thinks, and rightly too, that

اور کتنے مولویوں کی باتوں کو جو انہوں نے اپنے ذھن کی تیزی سے نکالی ھیں سند پکڑتے ھیں - (تقویۃالایمان' ص ۲)

In order to wreak vengeance on Maulavī Muḥammad Ismā'īl a host of *maulavīs* came forward to challenge him for his convictions, so much so that Maulavī Muḥammad Ismā'īl had to answer their objections in black and white. This explanatory treatise which was written in response to the objections raised by Maulavī Fazl e Ḥaq of Delhi, referred to before, on *Taqvīatul Īmān*, was written in Persian in one day and hence it is known as *Risāla e Yak Rūza*. Maulavī Fazl e Ḥaq had raised three objections to a statement made in the *Taqvīatul Īmān* and these were as follows :

(*i*) To say that God was empowered to create another man like Muḥammad, the Holy Prophet, was wrong.
(*ii*) To utter such a thing was a sacrilege.
(*iii*) To mention it is absurd.

Maulavī Muḥammad Ismā'īl, unlike Maulavī Fazl e Ḥaq, has very calmly and studiously upheld his statement giving quotations from the Qurān and *ḥadīṣ* as his authorities. Maulavī Fazl e Ḥaq, although not satisfied by this *risāla*, was completely silenced after its publication.

### 3. *Tanwīrul 'Ainain fī Iṣbāte Raf'al Yadain*

In this book Maulavī Muḥammad Ismā'īl has collected authentic traditions by which he has proved that *raf'e yadain* or 'removing the hands from the breast during

sickness or health, to bestow victory or defeat, to effect prosperity or adversity, as well as to accomplish desires, to avert evils, to protect in the time of difficulty, and to alleviate miseries, are all the qualities peculiar to God alone; and no other is endowed with such powers. If any one, by action or desire, attribute such influence to any of His creatures in the foregoing points, he is surely an associator of companions with God. It is called *ishrāk fit taṣarruf*, or " Association in the power of God." The transgressor will certainly be guilty, whether he considers the apostles, etc., to have been favoured with such command by God, or think that such power has been created by themselves.

The book is written in an impressive and forceful style. All the views expounded have been supported by the Qurān and *ḥadīṣ*. This has greatly enhanced the value of the contents and has given them a dignity, which cannot be challenged.

## 2. *Risāla e Yak Rūza*

As has been pointed out before, the publication of *Taqvīatul Īmān* caused a stir in the circle of the learned doctors of religion. It was considered a bombshell on the self-coined and age-old practices, which were venerated with a religious zeal. The *maulavīs* were all aflame to hear:

اس زمانے میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں۔
کتنے پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں۔ کتنے قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں۔

In the preface of *Taqvīatul Īmān* Maulavī Muḥammad Ismā'īl deprecates the opinion 'that the wise and learned alone can comprehend God's word. God himself said a prophet had been raised up among the rude and ignorant for their instruction, and that He, the Lord, had rendered obedience easy. There were two things essential, a belief in the unity of God, which was to know no other God, and a knowledge of the Prophet, which was obedience to the law. Many held the sayings of the saints to be their guide; but the word of God was alone to be attended to, although the writings of the pious, which agreed with the Qurān, might be read for edification.'

The first chapter, or the main portion of the book, treats of the unity of God, and in it the writer deprecates the supplication of saints, angels, etc., as impious. He declares the reasons given for such worship to be futile, and to show an utter ignorance of God's word. 'The ancient idolators had likewise said that they merely venerated powers and divinities, and did not regard them as the equal of the Almighty; but God himself had answered these heathens. Likewise the Christians had been admonished for giving to dead monks and friars the honour due to Lord. God is alone, and companions He has none; prostration and adoration are due to Him, and to no other.' Dilating upon the omnipotence of God, the writer says, 'To have a thorough control over the universe, to exercise full authority in it, to cause death or life, to extend or depress one's means, to occasion

A.D.), but its exact date of composition is not known. It is written in Urdu and was planned to comprise a preface and two chapters. Maulavī Muḥammad Ismā'īl lived to complete the first chapter alone, or that showing the extent to which the doctrines of Islam had become perverted in India. This portion has been translated into English as well [1] by Mīr Shahāmat 'Alī. A disciple Muḥammad Sulṭān completed the scheme by the addition of the second chapter, treating of the modes proper to be followed; but it is a lengthy and inferior production.[2]

---

work, *Tazkīrul Ikhwān* says:

اب سن بارہ سو پچاس ھجری میں اللہ تعالے نے اس خاکسار گنہگار
ھیچمداں محمد سلطان کے دلمیں ارادہ اُس کے ترجمہ کا ڈالا ..............
اور تذکیرالاخوان بقیہ تقویت‌الایمان اُس کا نام رکھا (*Tazkīrul Ikhwān*, p. 62)

Another external evidence brings us even nearer to the date of composition of *Taqvīatul Īmān*. It is a letter written in Arabic by Maulavī Muḥammad Ismā'īl to one Mullā Baghdādī, in which the Maulavī has tried to answer some of the objections raised by the Mullā to his book. This letter ends thus:

هذا المكتوب حين كنت نزيلا فى الكانفور سنة الف و مائتين واربعين
الى سيدناالبغدادى حين وسوسه‌الجهال بعد قراة كتابى۔ (*Letter*, p. 269)

Obviously the book was written and circulated before 1240 A.H., because it could invite comment only after it had been released for publication.

[1] *J.R.A.S.*, vol. 13, pp. 316-372.

[2] The translator of *Taqvīatul Īmān*, Mīr Shahāmat 'Alī, thinks that the supplementary volume to *Taqvīatul Īmān*, is *as-Ṣirāṭul Mustaqīm*, which is the subject of a paper in the *Journal of the Bengal Asiatic Society for November, 1832*, vol. i, p. 479. (*J.R.A.S.* vol. 13, p. 316, *f.n.* 1). This is wrong. Mīr Shahāmat has confused the two books, *viz.*, *Ṣirāṭul Mustaqīm*, which was written by Maulavī Muḥammad Ismā'īl, and *Tazkīrul Ikhwān*, which was composed by Muḥammad Sulṭan, as a supplement to *Taqvīatul Īmān*. See *f.n.* p. 25.

the cause of religion and faith. Sir Sayyid Aḥmad thinks that he wrote many books,[1] but unfortunately some of his works have not come down to us, on account of their not being preserved properly. Even as early as the time of Sir Sayyid all the works of Maulavī Muḥammad Ismā'īl were not traceable. From this it can be imagined how difficult it is to collect them all at this stage. I have, however, been able to have access to some of his works, which I will describe now. Some of them are printed books, mostly in Calcutta, and others are in manuscript form, although even some of these were also printed, but are not available now in that form. Besides inaccessibility to all the works of Maulavī Muḥammad Ismā'īl, it has not been possible to determine the exact dates of the composition of these works, as the author has not mentioned these dates anywhere. Still, where possible, I have tried to determine the approximate date of composition.

### 1. *Taqvīatul Īmān*

This is probably the most famous work of Maulvī Muḥammad Ismā'īl, although it is a small treatise intended to lay down a perfect rule of conduct for the guidance of the Faithful. The book was composed in the neighbourhood of and earlier than 1240 [2] A.H. (1823

[1] Sir Sayyid Aḥmad, *Āṣārus Ṣanādīd*, pt. 6, ii, 26.

[2] A supplementary volume to *Taqvīatul Īmān* was written by Muḥammad Sulṭān, a disciple of the Maulavī, in 1250 A.H. (1834 A.D.), which shows that *Taqvīatul Īmān* was composed before 1250 A.H. Muḥammad Sulṭān in his

From the commencement, his attention was engaged by the religious irregularities which had crept into Islam as well as the miseries of his fellow creatures in India. All his literary works, which I will discuss presently, are fraught with these of his ambitions. He succeeded in a great measure in reforming the religion, but lost his life, to the great regret of his countrymen, in attempting to alleviate their troubles

Since the times of Maulavī Muḥammad Ismā'īl India has not produced another man similarly enterprising and able. The late Dr. Iqbal used to say, ' India has hitherto produced only one MAULAVĪ, and that is Maulavī Muḥammad Ismā'īl.' He in his admirable undertakings seemed to have no interested motive. His chief aim was to do good to the country which had given him birth. Ranjit Singh is said to have offered to him and the Sayyid a handsome *Jāgir*, if they would give up their religious expedition. The request was contemptuously rejected, and the Lion of the Panjab was told that if he would adopt their course they would ask nothing beyond it.

Maulavī Muḥammad Ismā'īl left only one son named Muḥammad 'Umar, but the latter died in 1268 A.H. (1851 A.D.) leaving no issue behind.[1]

## *His Works*

Maulavī Muḥammad Ismā'īl started writing very early in his life, and in spite of his active outdoor life he continued contributing valuable articles and books to

[1] Muḥammad Ja'far, *Tawārīkh e 'Ajība*, p. 150.

been mentioned before, yet for this act of negligence he did not excuse him and rebuked him publicly in the mosque saying, 'Your wife, sir, has been with you for a night and you have neglected your duty towards God. How would you account for this on the Day of Judgment?' It is said that Sayyid Aḥmad offered a public apology to his disciple promising to be careful in future. Such was the strength of character and outspokenness that Maulavī Muḥammad Ismā'īl possessed.

During the turbulent days of his life, when he was busy in *Jihād*, Maulavī Muḥammad Ismā'īl was once staying in a *sarāe*, where a few learned scholars of the town came to ask him certain religious questions. When they reached the *sarāe*, they saw that instead of looking like a religious inactive priest, the Maulavī had donned the dress of a regular soldier, and with a Holy Quran and a sword hanging respectively around his neck and girdle, he was busy curry-combing his horse. The scholars amazed at the spectacle got their doubts removed and the Maulavī answered their question to their full satisfaction referring to the Holy Quran for authority. Then the scholars asked him as to how he managed to satisfy all questioners without having access to his library, as obviously he was not carrying about his library. The spontaneous reply was, 'I satisfy every questioner with this book (the Holy Quran), and if he persists in not being convinced I satisfy him with this sword. In the presence of these two I do not need a library.'

It was a custom amongst the women-folk of Maulavī Muḥammad Ismā'īl to offer a *ṣaḥnak* (an oblation to Faṭima, the daughter of the Holy Prophet) annually. Some sweets were cooked and only those women were invited to partake of this feast, who had been married once only. The women who had been married again after the death of or after separation from their first husbands, were not asked and allowed to join this feast. The edibles were also not allowed to be seen by a man. After coming in contact with Sayyid Aḥmad, when, once he saw this feast being held in his home, Maulavī Muḥammad Ismā'īl, protested against it and told his people that it was purely an innovation. His opinion was that anybody could join in eating proper food and the *ṣaḥnak* (صحنک) should not be reserved for women, who were married only once. The ladies approached Maulavī 'Abdul Qādir, the uncle and guardian of Maulavī Ismā'īl, with an appeal against the verdict of the Maulavī. Shāh 'Abdul Qādir, in spite of his being a very learned scholar, only to please the ladies wanted to hush up the matter by upholding their sentimental decision. But Maulavī Muḥammad Ismā'īl persisted in his purely Islamic view, and in defiance of all concerned, he distributed the whole of the food among poor people.

Once the wife of Sayyid Aḥmad came to him after a long interval of absence. Next morning the Sayyid was late for his prayers and did not attend the service properly. Although Maulavī Muḥammad Ismā'īl held his spiritual guide, Sayyid Aḥmad, in great esteem as has

The statement of Gardner eloquently testifies to the heroic disposition of the two reformers as much as it gives you an insight into the villainous character of Gardner and the treacherous nature of his followers.

### *The Man : Orator, Reformer, Preacher, Warrior and Writer*

Such was the end of a noble genius, Maulavī Muḥammad Ismā'īl, who was a man of very extensive literary attainments. He possessed a mild and manly temperament, and was simple and plain in his habits. He was an accomplished orator, and an excellent religious lawyer. His lectures were always delivered with great propriety, elegance and force, and he expressed himself with considerable care and perspicuity. He avoided superfluities, and was generally to the purpose, brief and modest, and always produced such proofs as were best adapted to enforce conviction. His biographers in Urdu have referred to a host of incidents which bear eloquent testimony to his attainments, his skill in oratory and his strength of character. I will, however, content myself with quoting a few of these to bring out the qualities of this illustrious son of Islam.

*History of the Sikhs*, 186-90 ; *Gazetteer of Hazara District*, 27, 28 ; *Gordon*, 103 ; *Gough*, 37 ; *Grey*, 108 ; *Hughes*, 176-77 ; *Khazan Singh*, i, 310 ; *Latif*, 437-43 ; *M'Gregor*, i, 196 ; *Mohan Lal*, i, 145-46 ; Prinsep, *Origin of the Sikh Power*, 145-51 ; *Sinha*, 95-6 ; *Stulpnagel*, 29 ; Kanhayyā Lāl, *Ẓafar Nāma*, 406-426 ; Abul Ḥasan 'Alī. Kanhayyā Lāl, *Tārīkh e Panjāb*, 321-30 ; *Ṭāhir*, and *Būte Shāh*, ff. 409-412.

army. They had been taken by surprise and isolated from the main body of the Syad forces, which fought very badly without their leader. Even as I caught sight of the Syad and *maulvi* they fell pierced by a hundred weapons. Those around them were slain to a man, and the main body dispersed in every direction.

'With some difficulty I kept my party together, and withdrew to the hills, showing so bold a front to the Sikhs that they did not dare to follow us far. The Eusafzai mountain-passes always gave the Sikhs cholera, as Avitabile[1] used to say.

'I was literally within a few hundred yards of the Syad when he fell, but I did not see the angel descend and carry him off to Paradise, although many of his followers remembered afterwards that they had seen it distinctly enough.

'I remained two nights at Panchtar, where I rested my men after their exertion, and divided the booty between them. The death of the Syad broke the only link that held his followers together, and in retreat many of the parties from different regions fell upon one another for plunder. My Khaibaris and Eusafzais were equal to the best in this matter, and cut down several of the Hindustani fanatics who had joined them for protection; and whose clothing or equipment seemed to them a desirable acquisition.'[2]

[1] General Avitabile, Ranjit Singhs' Italian governor of the Peshawar district.

[2] Pearse, Hugh, *Memoirs of Alexander Gardner*, pp. 166-73. *Cf.* Blumhardt, *Encyclopædia of Islam*, vol. i, pt. i, Court, *History of the Sikhs*, 71; Cunningham,

valuable to any ruler to whom I might subsequently offer them. Therefore, when Mir Alam Khan proposed to me to take command of those of his followers who desired to array themselves under the sacred banner of the Syad or Khalifa as he now styled himself, I fell in readily enough with his wish.

'In a few days I marched towards Balakot, the headquarters of Syad Ahmad, at the head of some 250 well-armed and warlike mountaineers, all burning with religious zeal and with the desire to work their will in the rich city of Peshawar. For rich it seemed to them, though at that time its prosperity was at a very low ebb, it having been for so many years handled about between the Sikhs and Afghans.

'As it turned out, we set out to join the holy standard just an hour too late, for the Syad and his faithful *maulvi* were slain, fighting bravely side by side, before we could join in the fight. They were taken by surprise at a place near Balakot and surrounded by a large party of Sikhs, who had crossed the river Indus on *massaks*, or inflated skins. In his anxiety to rejoin his master Muhammad Ismail had left me and my force a march behind, and, owing to the mistake or treachery of a guide, we took longer than we expected in coming up.

'I well remember the scene as I and my Eusafzai and Khaibari followers came in view of the action.

'Syad Ahmad and the *maulvi*, surrounded by his surviving Indian followers, were fighting desperately hand to hand with the equally fanatical Akalis of the Sikh

determined to destroy the reformer once and for all. He entrusted the task to his son, the Shahzada Sher Singh, whose operations were at first unsuccessful.

'Syad Ahmad had two faithful and trusted followers, the Maulavis 'Abdul Ha'ī and Muḥammad Ismā'īl, and these men strained every nerve to obtain assistance and reinforcements for their master.

'When Muhammad Ismail arrived at the Court of Mir Alam Khan the latter was in doubt what course to adopt. The religious enthusiasm of his people, and their hatred of the infidel Sikhs, impelled him to make common cause with the Syad, but at the same time he had substantial reasons to maintain friendly relations with Ranjit Singh, and more especially with the Wazir (or Prime Minister) Raja Dhyan Singh. The influence of the latter was very great throughout all the mountain regions on the northern boundaries of India.

'In this difficulty my arrival, with my trusty band of Khaibaris, was very welcome to the *mir*, and no doubt combined with his former friendship to elicit the warm reception which he gave me. He was wary enough to say nothing of his intentions to me for three or four days after my arrival, until my attention was attracted by an impassioned address which I heard Muḥammad Ismā'īl deliver to a large assembly of the wild Eusafzai mountaineers. The enthusiasm which he aroused suggested to me that I might do worse than join the Syad his master, as I saw a good opportunity of getting together such a body of followers as would make my services

in Afghanistan and arrival in the troubled regions of the North-West Frontier of India, when he records in his memoirs, 'I arrived at Bajaur at the moment that a certain Muḥammad Ismā'īl had arrived from the fanatic chief Syad Ahmad with a demand for aid from the *mir*, as from all neighbouring Muhammadan chieftains. This Syad Ahmad was a remarkable man, who gave much trouble for some years to Maharaja Ranjit Singh.

'Some four years prior to my arrival at Bajaur he had raised the green standard of the Prophet in the Eusafzai hills, between Peshawar and Attock, and proclaimed a religious war against the Sikhs. Syad Ahmad belonged to a family of Syads in Bareilly, and commenced life as a petty officer of cavalry in the army of Amir Khan, the great soldier of fortune. After preparing in India for the religious war which he desired to wage, Syad Ahmad entered Afghanistan; but finding no enthusiasm there, he proceeded with several hundred followers to Punjtar in the Eusafzai hills, and made that place his headquarters. This, as I have said, was early in the year 1827.

'After various vicissitudes the Syad actually became in 1830 master of the city and district of Peshawar, from which place he ousted Sultan Muhammad Khan. This prince was a brother of Amir Dost Muhammad Khan, and at this time ruled Peshawar as a tributary of Maharaja Ranjit Singh, the sovereign of the Panjab.

'This success of the Syad proved his ruin, for the Maharaja immediately occupied Peshawar in person, and

1826 A.D.), at Akora, a place about eight miles from Nowshera when the Sikhs were defeated with considerable loss. Maulavī Ismāʻīl was the commander of the advance guard in this action. Although the army of the *Ghāzīs* was ill equipped, yet their success against the Sikhs added much to their fame and strength, till Yār Muḥammad deemed it prudent to enter into agreement obliging him to respect the territory of the Yusūfzais.

### *A soldier till death, 1246 A.H./1830-31 A.D.*

After this action against the Sikhs the fighting career of Maulavī Muḥammad Ismāʻīl began. He always led the forces of the *Ghāzīs* and came out victorious till he was surprised and fell in the last battle on the 24th Zulqaʻda, 1246 A.H. (early in May, 1831), at Balakot, a place near Mansehra. where he was subsequently buried. As I am giving the details of the battles which he fought against Sikhs side by side with his religious guide Sayyid Aḥmad, in a monograph on Sayyid Aḥmad, I refrain here from repeating those facts. I shall, however, record here an eye-witness's account of the last moments of Maulavī Muḥammad Ismāʻīl for your benefit. This account has come to us from Alexander Gardner,[1] who soon after the event he has narrated, became a colonel of artillery in the service of Ranjit Singh. It was after his wanderings

[1] Alexander Gardner was born in 1785 in North America, on the shore of Lake Superior, and died at Srinagar, the capital of Kashmir, in 1877. He inherited an adventurous disposition from his parents. He sought first for a position in the Russian service, but accidentally lost it on the eve of attainment. Subsequently he travelled in Asia and served Afghan kings and later Ranjit Singh. Pearse, Hugh, *Memoirs of Alexander Gardner*, xvi.

one of the disciples of the Sayyid. In the beginning of the next year (1826 A.D.), the Ghāzīs reached the Peshawar frontier, crossing back into the Panjab through Khyber Pass without check.[1]

### *Declaration of War against Sikhs, 1242 A.H./1826 A.D.*

Maulavī Muḥammad Ismā'īl, along with the Ghāzīs stayed in Hasht Nagar, a place near Peshawar, for a while, and then declared a religious war against the Sikhs, by raising the flag of Muḥammad. Numbers of Afghans also joined the standard, and among the rest, Omar Khan of Panjtar was of great service to the leaders. The Panjtar family is of some consequence among the warlike Yusufzais, and as the tribe had become apprehensive of the design of Yār Muḥammad Khan, the chief of Peshawar, whose dependence on Ranjit Singh secured him from danger from the side of Kabul, the Sayyid and his Ghāzīs were hailed as deliverers, and the party succeeded in establishing its authority in the Yusufzai hills, without much difficulty. When the news reached the Lahore Court, Sardar Budh Singh, of the same family as the Maharaja, with an army of ten thousand was sent to give battle to the Ghāzīs.

### *First Action against Sikhs, 1242 A.H./1826 A.D.*

The first battle was fought with the Sikhs by the Ghāzīs on the 20th Jumada I, 1242 A.H. (21st December

[1] *Cf. Ḥayāt e Ṭaiyiba. Āṣārus Ṣanādīd*, ii, 27, 56, *Tawārīkh e 'Ajība*, 96, 97 ; and *Cunningham*, 186-90.

elucidation of the point by Ismā'īl, and with his influence and in collusion with the authorities, got the public assemblies prohibited in the mosques. Maulavī Ismā'īl had, however, infused sufficient religious ardour into the minds of his followers to prepare them for the grand service which he had in contemplation. This check, however, prevented him from making any further progress in India or from carrying into effect his favourite scheme at home, as is supposed by some to have been his original design.[1]

*Travels, 1241 A.H./1825 A.D. to 1242 A.H./1826 A.D.*

In 1824-25, he together with his religious guide Sayyid Aḥmad, and his relative 'Abdul Ḥa'ī, proceeded to Yāghīstān *via* Sind. They passed through Thānesar, Malerkotla, Bahawalpur, Hyderabad (Sind), Shikārpur and crossing through the Dhādar and Bolān passes they moved on to Pishin, Qandhar and Kabul. At the time they left Delhi, religious enthusiasm was so great that the expedition haunted almost every mind and some ten to twelve thousand people joined them. They were also soon followed from India by small parties, who moved in disguise, making up in all a considerable number. Sir Sayyid says that more than a lakh of Indians alone flocked to his standard. They were also aided in pecuniary matters by the native chiefs and private individuals, more especially by the Chief of Tonk, who was

[1] *Cf. Sir Sayyid*, ii, 57 ; and *M. Ja'far*, 144.

continued to embrace the reform unhestitatingly.

The opposition which Ismā'īl met with on the part of the *maulavīs*, gave no check to his resolute mind, but on the contrary, served to enhance still further his religious zeal. The number of his followers increased with his fame. The crowd of *namāzīs*, or sayers of prayers, was as great in his time in the grand mosque of Delhi as on the festivals of 'Īds. The truths which were disclosed by the industry of the reformer were never previously known, even to people of the first class.[1]

His rising influence, however, alarmed the local authorities. Maulavī Fazl e Ḥaq of Khairābād, who was the reader of the District Officer, objected seriously to the assertion of Maulavī Ismā'īl, in his book *Taqvīat-ul-Īmān*, that God had the power to create another prophet like Muḥammad. According to Maulavī Fazl e Ḥaq it was a blasphemy to make such an assertion. Maulavī Ismā'īl very deftly responded to the objection of this *maulavī* and quoted a verse from the Holy Qurān in which God had clearly mentioned that He could create another like them (human beings) if He wished to. The verse runs as follows :—

اليس الذى خلق السموات والارض بقادر على ان يخلق مثلهم۔ بلىٰ
وهوالخلاق العليم۔ (سورہ یسین)

" Is He who created the heavens and the earth not able to create the like of them ? Nay ! He is the All-Creator and the All-Knowing."

Maulavī Fazl e Ḥaq was very much annoyed at this

[1] *Cf. Sir Sayyid*, iī, 54 ; and *M. Ja'far*, 142, 144.

Rigid criticism and malicious censures were in consequence passed by the latter on his lectures. To remove differences of opinion, a meeting of the doctors was resolved upon and held in the grand mosque to discuss the points at issue; but the assembly broke up without coming to a decision regarding the controversy. Whatever may be the merits of the respective pretensions of the two parties, it is certain that Ismā'īl continued to gain unabated reputation as a popular and true expounder of the Islamic law, and the people were convinced of the imposition under which they had hitherto laboured.

When his opponents failed to defeat him in public controversy, they often tried to mislead his followers privately by artful arguments, but the impression made upon his adherents was so great that they never went astray. Many came prepared with difficult questions, but in the very next preliminary discourse, Ismā'īl generally gave such convincing and comprehensive explanations of the matter in question, that they dared not put to him any query. His opponents chiefly consisted of *maulavīs* and *khādims*, or attendants of the various tombs of Muslim saints. The revenue of the latter entirely depended on the offerings presented by ignorant visitors, and it was greatly checked by the religious instructions of Ismā'īl; and hence the *khādims* had interested motives for disliking him. The common people who had not had the chance of hearing or reading the truths disclosed by this preacher, continued to follow the old prejudices; but such of them as came to have a knowledge of the doctrines,

Muslims of India of late had been reduced, and which, when compared with the prosperous and happy state of the nations and tribes whom he had lately visited, seemed much more deplorable, excited the patriotic zeal of Maulavī Muḥammad Ismā'īl. The relief of his countrymen from their present miserable condition was the object which wholly engrossed his attention. Moved by this laudable and enthusing motive, he travelled throughout India, and went from town to town preaching the sermon of *jihād*. Emissaries were likewise sent into the interior to prepare the minds of Muslims for a religious war. Such was the powerful force of the orations of Maulavī Muḥammad Ismā'īl that in less than two years a majority of respectable Muslims were in his favour. At Delhi he generally resorted to the Akbarābādī Masjid, where Sayyid Aḥmad was lodged, and daily delivered religious lectures to those who gathered around him. He also preached in the grand mosque on every Friday and Tuesday. The assembly on these occasions was generally very great; so much so that one could hardly get near enough to hear him. In short, thousands of Muslims, who, owing to the indolence of other *maulavīs*, had yet remained ignorant of the true doctrines of their religion, were reclaimed from the darkness of ignorance in which they were plunged. His rapid success, however, excited the jealousy of the contemporary divines. Apprehending their own discredit with the public from the disclosure of the truth, they were of course offended at the incessant preachings of the indefatigable Ismā'īl.

### *Pilgrimage and return, 1237 A.H./1821 A.D. to 1239 A.H./1823 A.D.*

After performing the rites of pilgrimage, and visiting Medina, the party returned to Jeddah on the 1st Zulqa'da, 1238 A.H./1822 A.D.[1]

During this fourteen months' sojourn in the territory of Hejaz Maulavī Muḥammad Ismā'īl came in contact with many learned scholars of Arabia, Byzantine, Egypt, Syria and Bulgaria, and closely studied the conditions prevailing in those countries. From Jeddah the *ḥājīs* reached Bombay in about a month after staying for a few days in different parts on their way back home. From Bombay the party proceeded to Calcutta in boats and remained stationed in Calcutta for over two months after spending a month on the sea. On the 29th Sha'bān, 1239 A.H. (1823 A.D.) Maulavī Muḥammad Ismā'īl reached home after an absence of nearly three years.[2]

### *Preaching of jihād 1239 A.H./1823 A.D. to 1242 A.H./1825 A.D.*

The distressed and degraded condition to which the

[1] It is commonly believed that after the pilgrimage the party proceeded to Constantinople, where it was received with marked consideration. Here, it is said, the party stayed for six years and the Sayyid with the help of Maulavī Muḥammad Ismā'īl, succeeded in adding largely to the number of his disciples, and acquired in presents nearly nine lakhs of rupees in cash. (Mīr Shahamat Alī, *J.R.A.S.*, 13, 310). I have not been able to verify this incident from any authentic source.

[2] *Cf. Sir Sayyid*, ii, 27, 56 ; *M. Ja'far*, 67 ; and Muḥammad 'Alī, *Makhzan e Aḥmadī*, ff. 150 and152.

with him and at last on the 1st of Shawwāl, 1236 A.H. (1820 A.D.), when Maulavī Muḥammad Ismā'īl was in the thirty-eighth year of his age, they, together with four hundred of their followers (men, women and children), after saying their 'Īd prayers in Bareilly, proceeded to Calcutta, where the Sayyid had thousands of Muslims added to his followers. The party stayed in Calcutta for three months. During all this time Maulavī Muḥammad Ismā'īl remained busy in preaching to Muslims and broadcasting his ideas to them. An old class-mate of Maulavī Ismā'īl and a learned scholar, 'Abdur Raḥīm, who had become an atheist and who believed in and worshipped the sun only, was also living in Calcutta in those days. The Maulavī expressed his intention to convert him to his ideas after seeing him. But when 'Abdur Raḥīm learnt of it, he left the town without giving a chance to the Maulavī to meet him, as he was sure that in spite of all his learning and knowledge it would not be possible for him to face Maulavī Muḥammad Ismā'īl. After this long stay in Calcutta, the party hired eleven boats and boarded them in small groups. Landing in Jeddah and after travelling for eleven months the party reached Mecca on the 28th Sha'bān, 1237 A.H. (1821 A.D.)[1]

[1] *Cf. Sir Sayyid*, ii, 27; *M. Ja'far*, 61-64; and M. 'Alī, *Makhzan e Aḥmadī*, f. 127.

God, that it was not over till the dawn of the morn appeared. This miraculous exhibition of the Sayyid's supernatural power had such effect on the mind of the young *maulavīs* that the very same morning they most willingly received religious initiation from his hands, and thereafter became his close followers.[1]

### *Preparation and Journey for Ḥajj 1236 A.H./1820 A.D. to 1237 A.H./1821 A.D.*

This circumstance raised the fame of the Sayyid still higher, and in a short time he had numerous followers at Delhi. The chief of his first disciples and the most constant associates of all his fortunes, namely, Maulavī Muḥammad Ismā'īl and 'Abdul Ḥa'ī held him in such high esteem that they rendered him almost menial offices, running, it is asserted, with their shoes off, by the side of his palanquin, when he moved out, like common servants. Shāh 'Abdul 'Azīz, who was then alive, advised his disciple and his two famous relatives to preach the sermon of pilgrimage and to proceed to Mecca. They followed his advice, and as the Sayyid repaired to Bareilly to make preparations for *Hajj*, Maulavī Muḥammad Ismā'īl and 'Abdul Ḥa'ī wrote letters in different directions and proceeded themselves to Phulat and Saharanpur to bring their relatives and families to join this sacred task. As the news spread, hundreds of people requested the Sayyid to take them along

[1] *Cf. Sir Sayyid*, ii, 27; and *Muḥammad Ja'far*, 16.

was great, and drew numbers of people around him. Maulavī Muḥammad Ismā'īl also, together with his relative, Maulavī 'Abdul Ḥa'ī, son-in-law of Shāh 'Abdul 'Azīz, one day went to him purposely, when, for trial's sake, he observed that he had never yet been fortunate enough to offer his prayers with حضورقلب or 'presence of mind.' The Sayyid, with a smile, told him to come that night to his room to say the evening prayer, where he would acquire his desire. On hearing the remark, the inquisitive Maulavī grew very curious, and as soon as the fixed time arrived, he along with his companion, went to the room of the Sayyid. They were told to offer فرض 'the first portion of the prayer,' after him, and to complete the remainder separately, when they were both so deeply immersed in contemplating

ثواب اخروی و حاصل سری محتوی بر مسجد باحقوق مرافق داخله و خارجه وقف لازم شرعی نمود ومقرر ساخت که اگر بمرمت این امکنه احتیاج افتد آنچه از حاصل این موقوف بود بعدالترمیم باقی ماند بخدمه مساجد و حمام و طلبه علم رسانند والاتمام را بجماعه سطور بدهند این منازل منیعه در عرض دوسال بصرف صد . پنجاه هزار روپیه آخر شهر رمضان‌المبارک سال هزار و شصتم هجری مطابق بیست و چهارم جلوس عالم آرا صورت انجام پذیرفت - ایزد تعالیٰ اجر دین خیرجاری و نفع باقی بروزگار فرخنده آثار پادشاه دین پرور حق گزین حقیقت گستر بانیه این مبانی عامرهٔ مغانی عاید گرداند - آمین یا رب العالمین -

This mosque was destroyed sometimes after the war of 1857, and its site is located to be that, which is at present occupied by Edward Park. When the ground for this park was being cleared and levelled the foundations of the mosque were unearthed, but due to the apathy of the builders of new order in the town, this house of God was buried under dust for ever.

(Bashīruddīn Aḥmad, *Wāqi'āt*, ii. 140).

## *Contact with Sayyid Aḥmad, 1235 A.H./1819 A.D. to 1236 A.H./1820 A.D.*

While thus engaged, his attention was aroused by the arrival of Sayyid Aḥmad at Delhi from Tonk in 1819. The Sayyid had a tolerable knowledge of the Islamic law and bore a high character as a pious man. He was the religious disciple of S͟hāh 'Abdul 'Azīz, and had received his Arabic education from S͟hāh 'Abdul Qādir. It is asserted that it was from S͟hāh 'Abdul 'Azīz, that Sayyid Aḥmad derived orthodox religious opinions, which he subsequently promulgated, and the design which he adopted of preaching *jihād*. On his return to Delhi, he found that his teacher 'Abdul Qādir was dead, and had been succeeded in giving people literary instruction by his nephew, Maulavī Muḥammad Ismā'īl. The fame of the Sayyid, who put up in the Akbarābādi[1] mosque,

---

[1] This mosque was situated in the Faiẓ Bazar and was built by Izz-un Nisā Begum in 1060 A.H./1650 A.D., as the following inscription on its entrance signified :—

این مسجد فیض انتها و سرای راحت جا و حمام نظافت اما چوک دلکشاء که عبادت گاه حق پرستان روزگار و روح افزای متردداں اقطار ونزهت کده آسمانیان ودارالنفع زمینیان است. در عهد سعادت مهد بادشاه اسلام کهف انام سایه والا پایه پروردگار خلیفه برگزیده کردگار رحمت اعم ذی الجلال مظهر ایزد دارا بیهمال ابوالمظفر شهاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاهجهان پادشاه غازی پرستار خاص بادشاهی پرستنده باخلاص ظل اللهی موفقه خیرات و مبرات محررة سعادات وحسنات اعزالنسا مشهوره با کبر آبادی محل بفرمان معلی بنا کرد و بجهت ابتغای مرضای الهی افتدای

admiration at his mental faculties. He had an excellent knowledge of moral philosophy, mathematics, rhetoric, logic as well as of the science of commentary (*tafsīr*) and tradition, besides a respectable knowledge of the doctrines of Islam and Islamic law.[1]

### *Early Career 1212 A.H./1797 A.D. to 1235 A.H./1819 A.D.*

He started in life as a preacher. He commenced preaching, in the grand mosque at Delhi, sermons in favour of the unity of God and against idolatory; and he enlightened his countrymen on the respective nature of these doctrines by composing and publishing a treatise with the title, '*Taqvīatul Īmān.*' or 'Strengthening of Faith.' From the very commencement of his worldly career he was a true advocate of his religion and was earnestly devoted to its cause. The abuses and innovations which had crept into its doctrines among the Muslims of India attracted his early attention. He found them deeply plunged in the vices of *shirk* or 'attribution of a copartner to God,' or at least heresy, the Qurān and *Ḥadīṣ* having been almost entirely neglected, and the popular prejudices having been substituted as their chief guides.[2]

[1] *Cf.* Sir Sayyid's *Āṣārus Ṣanādīd*, iii, 56; and Muḥammad Ja'far's *Tarikh e 'Ajība*, 143.

[2] *Cf.* Cunningham's *History of the Sikhs*, 186; Hunter's *Indian Musalmans*, 67 *f.n.*; and Ismā'īl's *Taqvīatul Īmān*.

Muḥammad Ismā'īl was possessed of good parts and high talents, and he had a very ingenious mind, and a retentive memory. As is the case generally in youth, he was not very attentive to his studies. Swimming in the river Jamna was one of his favourite amusements, and in this art he acquired so much skill that he used to cross the river occasionally swimming at a stretch. He was irregular in his attendance on his guardian and preceptor 'Abdul Qādir. From his natural talents, however, he was looked upon as 'the hope of the family,' and no pains were spared in his intellectual culture. For his obvious negligence of his studies once his class-fellows complained to their teacher. Muḥammad Ismā'īl, on being questioned, opened his book at random, and began to read much in advance of his previous lesson. When he was told that it was not the place where he ought to have commenced, he said that there was no difficulty that he could not fully comprehend in the part which he had omitted. To verify his statement the teacher questioned him on a point, about which he gave such a full and masterly explanation that all the hearers were astonished. He finished his education in the fifteenth or sixteenth year of his age. The fame of his high abilities soon spread far and wide. It is said that to test his learning, some of the classical scholars would studiously meet him in the streets to prevent his having reference to books, and put him most difficult questions; but he would answer every point so explicitly and satisfactorily that they always expressed their wonder and

## *Birth and early life, 1196 A.H./1781 A.D. to 1212 A.H./1797 A.D.*

Maulavī Muḥammad Ismā'īl was the nephew [1] of the famous Shāh 'Abdul 'Azīz, whose family is still universally held in great veneration and respect all over India. He was the only son of 'Abdul Ghanī, son of Shāh Walīullah, the most celebrated traditionist and the best student of divinity of his time. Shāh Walīullah had four sons; *viz.*, the father of Maulavī Muḥammad Ismā'īl, Maulavī 'Abdul 'Azīz, Rafī'uddīn, and 'Abdul Qādir. They were all famous for their literary attainments and religious characters. The family traces its pedigree to 'Umar, the second *khalīfa* of the Orthodox Khilāfat.

Maulavī Muḥammad Ismā'īl was born on Saturday, the 28th of Shawwāl, 1196 A.H.[2] (1781 A.D.), in the village of Phulat, in the Delhi territory, from Fazīlatun Nisā, the daughter of Maulavī 'Alāuddīn, of the same place. On the death of his father, which occurred while he was very young, he was brought up as an adopted son under the care of his uncle 'Abdul Qādir. Subsequently he was married to the latter's grand-daughter [3] (نواسی).

[1] *Cf.* Sir Sayyid Aḥmad, *Āṣārus Ṣanādīd*, iii, 56; Bashīruddīn Aḥmad *Wāqi'āt*, ii, 411: and Beale, *Biographical Dictionary*.

[2] *Cf.* Beale, *Biographical Dictionary*; Hidāyat Hosain, *Encycl. of Islam*, ii, pt. I, p. 549; and Ṭāhir, M. *Hayāt e Ṭaiyiba*.

[3] *Cf.* Sir Sayyid Aḥmad, *Āṣārus Ṣanādīd*, iv, 56: and Bashīruddīn Aḥmad, *Wāqi'āt*, ii, 411.

which is named after its founder Khwāja Mu'īnuddīn Chishtī, whose tomb is at Ajmer. These divisions had disintegrated the unity of Muslims, and after the decay of the Mughal rule they had even lost the prestige of being labelled as a mass of homogeneous *millat*. Besides the political and social decay the religious differences were rampant amongst them. Foreigners as well as non-Muslim Indians were making use of this opportunity and no stone was left unturned to heap humiliation and disgrace on the head of this scattered community. A Maulavī of Qanauj has painfully recorded the plight of Muslims of those days in his book '*Targhībul Jihād*.'[1] 'The tribe of Sikhs,' he says, 'have long held sway in Lahore and other places. Their oppressions have excelled all limits. Thousands of Muslims they have unjustly killed, and on thousands have they heaped disgrace. The *azān*, or summons to prayer, and the killing of cows, they have entirely prohibited.' Malcolm[2] speaking of the period when the British army under Lord Lake pursued Holkar into the Panjab, in 1805, has supported the view of this Maulavī, who very deftly in a few words has described the existing condition of Muslims in India. Against all those factions and innovations, which had ultimately led the Muslims to this hopeless state of confusion and disgrace, there rose a great man of his times, Maulavī Muḥammad Ismā'īl whose revered memory we have gathered here to celebrate to-day.

[1] *J.A.S.B.*, 1832, vol. i, 482. [2] *Ibid.*

# MAULAVĪ SHAH MUḤAMMAD ISMĀ'ĪL

## *Indian Muslims in the Nineteenth Century*

SINCE the days of خلافت راشده (The Orthodox Khilāfat) Islam has produced very few Muslims of the real Islamic type and puritans like Maulavī Shāh Muḥammad Ismā'īl have been even fewer. When we consider the state of affairs of the Indian Muslims in the first half of the nineteenth century, it seems surprising that from this nation rose men gifted with such a surpassing degree of religious acumen and illumination that for the time being they swept the masses off their feet with their religious zeal, and drawing them out of the dark ignorance, in which the Indian Muslims had submerged themselves, led them to those modes of religious exercise which are believed by the most orthodox Muslims to have an influence in purifying and strengthening the higher orders of human minds, and which enabled them, even in life, to attain to the most exalted state of spiritual dignity and power. Indian Muslims of that time, like some of the present-day Muslims, were divided in peculiar divisions, which prevailed (and still prevail) among those who aspired to the honours of religious initiation. Some belonged to the *Qādirīa* sect, which traces its origin to 'Abdul Qādir of Gīlān, and others associated themselves with the *Naqshbandī* sect, which is composed of the followers of Khwāja Bahāuddīn Naqshband, a native of Bukhārā. A third group attached itself to *Chishtīa* sect,

# A WARRIOR SCHOLAR OF THE NINETEENTH CENTURY

*by*

DR. MUHAMMAD BAQIR
*M.A., Ph.D. (London)*
*Oriental College, Lahore*

شرک را در دینِ احمد راه نیست     برتر از مشرک کسے گمراه نیست

شرک اندر علم و اندر اختیار     شاہرا ہست جانبِ دارالبوار

حاجتِ خود را تو از خالق بجوئی     قبر کے کس را بہ بخشد آبروئی

آں نداند تا مگس راند ز جا     پس بگیر عبرت ز احکامِ خدا

تو دریں گفتار اند رشک مماں     اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى بخواں

# در یاد شاہ اسمعیل شہید

اے قلم بنویس حالات شہے — ثانیش پیدا نہ شد بعدش کسے

ہندیانِ خفتہ را بیدار کرد — بندگانِ نفس را احرار کرد

خونِ خود را در کُہ و کہسار ریخت — ایک بیخِ حرّیت در ہند بیخت

اے ذبیح اللہ اسماعیلِ ما — شد ندایت صورِ اسرافیلِ ما

در رہِ حق تیز چون بشتافتی — حادیٔ دوران خود را یافتی

شرک و بدعت را ز بنِ برکندۂ — گلشنِ دین را طراوت دادۂ

ہمچو مجنوں خویشتن را سوختی — شیوۂ عشاقِ نجد آموختی

اندراں وقتے کہ در ہندوستاں — سنّت اندر ابرِ بدعت بد نہاں

گفت اسماعیل معبودم خداست — پیشوائے من محمدؐ مصطفیٰ است

ترک بہ رسمے کہ در اسلام نیست — گم بہ آں شیوہ کہ در احکام نیست

صرف کردہ بیہدہ دولت چرا — مے خری خسران تو اندر دو سرا

# IN MEMORY OF SHAH ISMAIL SHAHEED

*by*

His Late Highness
NAWAB SIR MUHAMMAD NASIR-UL-MULK
*Mehtar of Chitral*

# CONTENTS

accretions were severely condemned, the pure monotheism of Islam was preached in all its uncompromising simplicity, and the Koran and 'Sunnah' were taken as the sole guide for Muslim conduct.

The Maulana, who had perfect faith in Islam as a living moral force, fought for the realisation of a high ideal. This ideal shaped and determined his whole outlook on life, and in trying to realise it he made the supreme sacrifice—he laid down his life and achieved immortality ;—

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

I should be failing in my duty if I did not offer my sincere thanks to the All-Punjab Muslim Students' Federation, and especially to its energetic and capable Secretary, Mr. Abdullah Butt, for having inaugurated this series of Muslim National Heroes.

Savoy Hotel, B. A. KURAISHI.
Mussoorie,
*15th August, 1943*

# FOREWORD

The present volume represents a collection of papers read on the occasion of "Maulana Ismail Shaheed Day" celebrated in the Habibia Hall, Lahore, in 1941, under the auspices of the All-Punjab Muslim Students' Federation.

Why the Federation chose Maulana Ismail Shaheed out of a galaxy of Muslim heroes will be easily apparent to those who happen to read this volume. By the end of the eighteenth century the Muslim world had sunk to the lowest depth of its decrepitude, and India was no exception to it. Nowhere were there any signs of health and vigour ; everywhere were stagnation and decay. Political Islam lay hopelessly prostrate. As for religion, it was as decadent as every thing else. The pure monotheism preached by the Prophet of Islam had become overlaid with a rank growth of superstitions, and the moral precepts of the Koran had begun to be ignored and even defied. In this dark hour the Maulana raised his powerful voice and called the Faithful back to the true path. This puritan reformer kindled a fire which soon spread to the remotest corners of India, purifying Islam of its sloth and reviving the zeal and fervour of olden days. The aim of this 'Islamic Revival' was the reform of abuses, the abolition of superstitious practices, and a return to the pristine purity of Islam. All later

# FOREWORD

*by*

DR. B. A. KURAISHI
*M.A., Ph.D. (Berlin)*
*Head of the Arabic Department, Punjab University.*

their multifarious professional and educational activities. Thanks are also due to Dr. B. A. Kuraishi who was so kind as to write the Foreword. The All-Punjab Muslim Students' Federation always found in him a friend and a guide.

Mr. F. K. Khan Durrani has very kindly read the proofs.

It is a matter of sadness to record that His Highness the Mehtar of Chitral is no longer with us. His Highness took a keen interest in the affairs of the All-Punjab Muslim Students' Federation. May his soul rest in peace.

13, Brandreth Road, ABDULLAH BUTT
Lahore.
*15th August, 1943.*

footsteps of that great son of India."

In the absence of His Highness the Mehtar, the first session was presided over by Maulana Obaidullah Sindhi, and the second session by Maulana Sayyid Abul Ala Maudoodi. The occasion attracted record audiences.

Political servitude is a crushing calamity, and the tragedy of the Indian Musalmans is not only physical slavery but also mental suppression. The process of degeneration with a *Millat*, which brought the message of liberty and equality long before the French Revolution, was unusually rapid. They set aside the glorious tradition of Islam which is the truest message of democracy and human equality, and forgot those who worked political, cultural and religious revolution in the society.

Shah Ismail Shaheed and Sayyid Ahmad Brelvi, giants in the life of the spirit as they were and possessing as they did the will to rise in revolt against the current of history and endeavour to turn it into a different channel, would have occupied a very high place and do occupy an honoured place in the history of Islam. It is not for nothing that their memory is held in honour and reverence in the whole of Muslim India. The All-Punjab Muslim Students' Federation rightly feel proud that the honour of celebrating the memory of these great sons of Islam fell to them.

I whole-heartedly thank Dr. Baqir, Dr. Khalid, Prof. Abdul Qayyum, Mirza Abdullah Anwar Beg and Maulana Saeed Ahmad, who complied with my request in spite of

# PREFACE

The All-Punjab Muslim Students Federation undertook the presentation of Islamic heroes. This purpose was achieved by the celebration of the memories of those heroes and later on publishing authentic accounts of their life-histories. This organisation of the Muslim students was the first in India to celebrate the Tipu Shaheed Day. Soon after, prominent scholars and historians were approached with a request for contributions on the life of Tipu, the standard-bearer of liberty, equality and fraternity. These contributions were published in the form of a book.

The present volume is the collection of papers in English read on the occasion of "Shah Ismail Shaheed Day". The celebrations were to be presided over by His late Highness Al-Hajj Nawab Sir Muhammad Nasir-ul-Mulk, Mehtar of Chitral. But due to unavoidable circumstances His Highness could not attend the celebrations and had to fly back home from Delhi. His Highness, however, sent us the following telegraphic message to associate himself with the occasion :—

> "Sorry, had to fly back as it was imperative. I congratulate you on celebrating Ismail Shaheed Day who I think was one of the most outstanding personalities in the history of Islam. May God give you the courage and foresight to follow in the

Printed at the Ripon Printing Press, Bull Road, Lahore by Mirza Muhammad Sadiq
and published by M. N. HUMAYUN, B.A., Manager, Qaumi
Kutub Khana, Railway Road, Lahore

ASPECTS OF

# SHAH ISMAIL SHAHEED

ESSAYS ON HIS LITERARY
POLITICAL & RELIGIOUS ACTIVITIES

*Edited by*

ABDULLAH BUTT

SECRETARY

*All-Punjab Muslim Students Federation*

**1943**

QAUMI KUTUB KHANA

65, RAILWAY ROAD LAHORE

# ASPECTS
*of*
# SHAH ISMAIL SHAHEED